اِس شمارے میں

نورِ ہدایت	ہر صدقہ اور نذر اللہ کے علم میں ہے		۵
نظر وفکر	سعودی حکومت کو مخلصانہ مشورہ.....	محمد سلمان منصور پوری	۶
درسِ حدیث	دنیا اور آخرت کے فرق کو پہچانئے!	مولانا اشہد رشیدی صاحب	۱۵
افاداتِ قرآنیہ	افادات سورۂ ''والنجم''	حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ	۲۱
مقالات ومضامین	مادیت کا فتنہ اور اُس کا علاج	محدث العصر مولانا محمد یوسفؒ بنوری	۲۷
	ایمان کے چند اَہم شعبے	مولانا اسرار الحق قاسمی	۳۱
	عصرِ حاضر میں دینی مدارس	مولانا مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی	۳۵
	یہ بھی خیانت ہے	مولانا مفتی تنظیم عالم قاسمی	۴۱
	انصارِ مدینہ میں سب سے پہلے.....	مولانا مفتی ابوجندل قاسمی	۴۶
ذکرِ رفتگاں	مولانا سید شوکت علی نظیر صاحبؒ	مولانا انوار احمد قاسمی	۵۱
کتاب المسائل	رجعت سے متعلق مسائل	مفتی محمد سلمان منصور پوری	۶۰
عالمی خبریں	بہار میں بی جے پی کو شکست فاش.....		ٹائٹل
منظومات	سوا تیرے نہ رہ جائے کوئی.....	مولانا محمد اعظم قاسمی	۴۵
جامعہ کے شب وروز	شیخ طریقت حضرت مولانا قمر الزماں صاحب کی تشریف آوری، مہتمم جامعہ کے اسفار، واردین وصادرین، وفیات		۶۷

نورِ ہدایت:

ہر صدقہ اور نذر اللہ کے علم میں ہے

ارشادِ ربانی: وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ. (البقرۃ: ۲۷۰)

ترجمہ: ''اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو یا کچھ بھی نذر مانو، تو وہ اللہ کے علم میں ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں''۔

اوپر سے صدقہ خیرات کی گفتگو چل رہی تھی، اِسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ لوگ جو کچھ بھی اچھی یا بری نیت سے لوگوں کو دکھا کر یا خفیہ طور پر صحیح یا غلط جگہ مال خرچ کرتے ہیں، تو اُن کی سب باتوں کا اللہ تبارک وتعالیٰ کو پورا پورا علم ہے، اور اِسی اعتبار سے ہر ایک کو بدلہ ملتا ہے، یعنی اگر شرعی حدود کی رعایت ہو تو اَجر وثواب سے نوازا جاتا ہے اور اگر حکم شرعی کا لحاظ نہ ہو تو ثواب سے محرومی رہتی ہے۔

اِسی طرح اگر کوئی شخص منت مانے تو اُس کی دو صورتیں ہیں: اول یہ کہ یہ منت اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، مثلاً یہ کہے کہ میں اللہ واسطے فلاں کام (عبادت) کروں گا، یا اگر میرا فلاں کام ہوجائے تو میں اتنے روپیہ صدقہ کروں گا وغیرہ، تو ایسی نذر حسبِ شرائط پوری کرنی واجب ہوجاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ منت اللہ کے علاوہ کسی مخلوق کے لئے مانی جائے، مثلاً کسی بت پر چڑھاوا چڑھائیں، یا کسی مزار پر صاحبِ قبر سے تقرب کی غرض سے نذر ونیاز کریں تو یہ شریعت میں جائز نہیں ہے، اور ایسی نذر پر عمل حرام ہے۔

اَب جو شخص جس طرح کی بھی جائز یا ناجائز نذر اور منت مانتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کو اُس کے بارے میں بھی پوری خبر ہے۔

اِس لئے صدقہ خیرات کا معاملہ ہو یا نذر اور منت کا، سب میں نیتوں کی درستگی اور شرعی حدود کا خیال رکھنا ضروری اور لازم ہے، ورنہ بعد میں رسوائی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا، اور قیامت میں جب اِس کوتاہی پر سزا کا اعلان ہوگا تو گنہگاروں کے حق میں کوئی آواز اُٹھانے والا یا اُن کی مدد کرنے والا دستیاب نہ ہوگا؛ کیوں کہ بارگاہِ خداوندی میں کسی کو بلا اِجازت دم مارنے کی بھی ہمت نہ ہوگی، بڑے بڑے مقربین بارگاہ پر بھی خوفِ خداوندی غالب ہوگا، ایسے ماحول میں مجرمین کی مدد اور نصرت کا کوئی تصور نہ ہوگا۔ پس اُس دن کی رسوائی سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ دنیا میں اپنے معاملات اللہ تعالیٰ سے درست رکھے جائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا وآخرت کی رسوائی سے محفوظ رکھیں، آمین۔ □□□

نظر وفکر

سعودی حکومت کو مخلصانہ مشورہ:

محمد سلمان منصورپوری
Mansoorpuri
@gmail.com

فروعی مسائل میں اِختلافات کو ہوا نہ دی جائے

اُمت میں شروع ہی سے فروعی مسائل میں اختلافات رہے ہیں، اور ہر مجتہد نے اپنی رائے کا مدار کسی نہ کسی دلیل پر رکھا ہے، اِس طرح کے اختلافات کو دورِ صحابہ میں بھی برداشت کیا گیا اور بعد میں بھی سلف صالحین نے اُنہیں کبھی محاذ آرائی کا موضوع بنانا پسند نہیں کیا؛ بلکہ اگر اُن کے سامنے یہ پیش کش کی گئی کہ سارے عالم کے مسلمانوں کو ایک ہی رائے پر قائم کردیا جائے تو اُنہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

چنانچہ تابعی جلیل قاضی دمشق حضرت سلیمان بن حبیب محاربیؒ فرماتے ہیں کہ: ''خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ یہ اِرادہ کیا کہ ساری مملکت کو ایک ہی طرح کے مسائل واَحکام پر جمع کرنے کی کوشش کی جائے؛ لیکن پھر آپ کو خیال آیا کہ مختلف شہروں میں الگ الگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مقیم رہے ہیں، اور وہاں جو معاملات پیش آئے اور جو مسائل پوچھے گئے، اُن کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم نے الگ الگ رائیں دیں، جنہیں ہر علاقہ کے لوگوں نے قبول کرلیا، اور گویا کہ وہ اپنے علاقہ میں ایک رائے پر متفق ہوگئے، اور آج تک وہ اُسی پر قائم ہیں، اَب اُنہیں اگر کوئی دوسرا حکم دیا جائے گا تو انتشار ہوگا، اِس لئے آپ نے اپنا اِرادہ ملتوی فرمادیا''۔ (تاریخ ابی زرعہ دمشقی ۲۰۲/۱ بحوالہ: معالم اِرشادیہ للشیخ عوامہ ۳۶۷)

اور اِمام دارمیؒ نے اپنی سنن میں لکھا ہے کہ حمید الطّویلؒ نے خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے عرض کیا کہ: ''کیا اچھا ہو کہ آپ سب لوگوں کو ایک ہی رائے پر جمع فرمادیں''، تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب دیا کہ: ''مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ سب لوگ متفق ہوجائیں اور جزئی مسائل میں اختلافات نہ کریں''، پھر آپ نے سبھی صوبوں کے گورنروں کے نام یہ فرمان بھیجا:

لِيَقْضِ كُلُّ قَوْمٍ بِمَا اِجْتَمَعَ عَلَيْهِ فُقَهَائُهُمْ. (معالم ارشادية ٣٦٧)

ہر قوم اپنے یہاں کے فقہاء ومفتیان کی متفقہ آراء پر فیصلے کیا کرے۔

اور محدث ابن ابی حاتم حضرت امام مالکؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ سے خلیفۂ وقت ابوجعفر منصور نے کہا کہ: ''میرا اِرادہ یہ ہے کہ سارے ملک میں ایک ہی طرح کے مسائل جاری ہوں؛ لہٰذا

آپ اُنہیں تحریر کردیں میں اُنہیں حکام وقضاۃ کے پاس بھیج کر نافذ کراؤں گا، اور جو اِس پر عمل نہیں کرے گا، میں اُس کی گردن اُڑادوں گا''۔ تو حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: ''امیر المؤمنین! میری رائے یہ نہیں ہے، اِس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اِس اُمت میں تشریف فرما تھے، اور آپ جہاد کے لئے جماعتیں روانہ فرماتے تھے؛ لیکن آپ کی وفات سے قبل سارے علاقے فتح نہ ہوسکے، یہ سلسلہ خلیفہ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بھی جاری رہا، اُن کے دور میں بھی زیادہ فتوحات نہیں ہوئیں؛ تا آں کہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بکثرت شاندار فتوحات ہوئیں، اور آپ اِس بات پر مجبور ہوئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعتوں کو مختلف علاقوں میں بھیج کر دین کی تعلیم عام کریں، پس یہ علم اُن صحابہ سے نسلاً بعد نسلٍ لیا جاتا رہا ہے، اَب اگر آپ یہ کوشش کریں گے کہ لوگ اپنی پہلے کی معلومات کو چھوڑ کر نئے مسئلوں پر آجائیں تو وہ اُسے کفر کی طرح ناگوار سمجھیں گے، اِس لئے ہر شہر والوں کو اپنے علم پر برقرار رکھیں''۔ (معالم ارشادیہ ۳۶۸)

اور ایک روایت میں ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے حضرت امام مالکؒ سے درخواست کی کہ ''ہماری خواہش ہے کہ آپ کی تالیفات (موطا وغیرہ) نقل کرا کر ملک وبیرونِ ملک بھیج دی جائیں؛ تا کہ لوگ اُن پر عمل کریں''۔ تو حضرت امام مالکؒ نے کمالِ اخلاص کا ثبوت دیتے ہوئے جو جواب دیا وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا:

يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! إِنَّ اِخْتِلَافَ الْعُلَمَاءِ رَحْمَةٌ مِنَ اللّٰهِ عَلىٰ هٰذِهِ الْأُمَّةِ كُلٌّ يَتَّبِعُ مَا صَحَّ عِنْدَهُ وَكُلٌّ عَلىٰ هُدًى، وَكُلٌّ يُرِيْدُ اللّٰهَ. (كشف الخفاء ١/٦٥، معالم ارشادية ٣٧١)

اے امیر المؤمنین! فروعی مسائل میں علماء کا اختلاف اِس اُمت پر اللہ کی رحمت ہے، ہر آدمی اپنے نزدیک صحیح بات پر عمل کرتا ہے، اور یہ سب ہدایت پر ہیں، اور سب کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔

اور اِمام اعظم حضرت اِمام اَبوحنیفہؒ نے اپنی آراء کے بارے میں یہ چشم کشا جملہ ارشاد فرمایا:

هٰذَا الَّذِيْ نَحْنُ فِيْهِ رَأْيٌ لَا نُجْبِرُ أَحَدًا عَلَيْهِ وَلَا نَقُوْلُ إِنَّهُ يَجِبُ عَلىٰ أَحَدٍ قُبُوْلُهُ بِكَرَاهِيَّةٍ، فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ

ہم جس موقف پر ہیں وہ ایک رائے ہے، ہم کسی کو اس پر مجبور نہیں کرتے، اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص پر اس کا زبردستی قبول کرنا واجب ہے؛ لہٰذا جس کے

شَـيْءٌ أَحْسَنَ مِنْهُ فَلْيَأْتِ بِهِ. (الانتقاء ۱٤۰، معالم ارشادیة ۳۷۵) پاس اِس سے اچھی (اور مدلل) رائے ہو وہ پیش کرے۔

درج بالا تفصیلات سے یہ معلوم ہوگیا کہ اجتہادی اور فروعی مسائل میں تشدد، تعصب اور ایک دوسرے کی تفسیق وتضلیل کی گنجائش نہیں ہے؛ بلکہ اعتدال، تحمل اور میانہ روی ضروری ہے۔

سعودی حکومت کی ذمہ داری

''حرمین شریفین'' چوں کہ تمام مسلمانوں کے مرکز اور مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہر ملک کے مسلمان وہاں حج وعمرہ کے لئے حاضر ہوتے ہیں، اور عبادات انجام دیتے ہیں، اِس لئے بجا طور پر سعودی حکومت کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اجتہادی مسائل میں سبھی اہل حق آراء کی رعایت رکھے۔ اِسی طرح سعودی عرب کے مختلف شہروں میں ہندوپاک سے آئے ہوئے جو ہزاروں لوگ بسلسلۂ روزگار مقیم ہیں، جو اکثر فقہ حنفی سے وابستہ ہیں، اُنہیں اپنے مسلک پر عمل کی آزادی ہونی چاہئے، اور منصوبہ بندی کے ساتھ اُنہیں اپنا مسلک چھوڑنے کی ذہن سازی نہیں ہونی چاہئے، خود قریبی زمانہ تک سعودی حکومت کے اعلیٰ ذمہ داران اِس کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں کہ اُن کی حکومت عملاً حنبلی ہونے کے باوجود ائمہ اربعہ کی آراء کے احترام کی پابند ہے۔

اور سابق امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے ایک انٹرویو میں انصاف پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ وضاحت کی ہے کہ: ''ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید غیر مجتہد کے لئے جائز ہے، اُس کا کفر وشرک کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، ائمہ اربعہ حق اور دین حق کے داعی ہیں، اُنہوں نے اپنے نفوس کو علم شریعت کے سیکھنے سکھانے کے لئے وقف کردیا، حتیٰ کہ اِس علم کا بڑا حصہ پایا جس کی وجہ سے اُن میں اجتہاد کی قدرت وصلاحیت پیدا ہوگئی، سو عامۃ المسلمین جو اُن کے مقلد ہیں وہ راہِ ہدایت اور راہِ نجات پر ہیں، انشاء اللہ تعالیٰ''۔ (ماخوذ از: غیر مقلدین اور فقہ، مرتبہ: مفتی شعیب اللہ خان مفتاحی)

اِس وضاحت سے صاف معلوم ہوگیا کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کی بھی فقہ پر چلنے والے لوگ ہرگز قابل مذمت نہیں ہے، اور اُن پر طعن وتشنیع کی اجازت نہیں ہے۔

ایک اہم واقعہ

دس بارہ سال پہلے کی بات ہے ہم لوگ حج کے بعد مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً میں مقیم تھے، وہاں کئی دن

مسلسل یہ بات دیکھنے میں آئی کہ ''ریاض الجنۃ'' میں روضۂ اَقدس کی جالیوں کے قریب ایک نیپالی نوجوان (جو نگرانی پر مامور تھا اور اُردو بولتا تھا) روزانہ عصر اور مغرب کے بعد جو بھی اُردو بولنے والا ہندوستانی یا پاکستانی حاجی اُسے مل جاتا، اُسے لے کر فروعی اختلافی مسائل پر گفتگو شروع کر دیتا، اور اَپنی زور بیانی سے ناواقف حجاج کو حنفی مسلک کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا، اور یہ گفتگو اِس انداز میں ہوتی کہ قریب میں نوافل اور ذکر واَذکار میں مشغول لوگوں کی عبادت میں خلل بھی پڑتا تھا۔ کئی مرتبہ اُس نوجوان کو توجہ بھی دلائی گئی؛ لیکن وہ اپنے عمل سے باز نہیں آیا۔ تو ہم چند ساتھیوں نے مل کر یہ مشورہ کیا کہ اُس کی شکایت مسجد نبوی کی انتظامیہ سے کرنی چاہئے، چناں چہ ہم لوگ اُس دفتر میں گئے جہاں نگراں حضرات کی ڈیوٹیاں تقسیم ہوتی ہیں، اور اُن سے پوری صورتِ حال بتلائی، تو اُنہوں نے ہماری بات پر توجہ دینے کے بجائے فروعی مسائل پر بحث شروع کر دی، اور اپنی دلیلیں دینے لگے، ہم نے کہا بھی کہ ہم بحث کے لئے نہیں آئے؛ بلکہ ایک فتنہ سے آگاہ کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں، تو اُنہوں نے کہا کہ آپ مسجد نبوی کے ''**هيئة الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر**'' کے رئیس سے ملیں، جن کا دفتر ''بابِ بلال'' کے اوپر ہے۔

چناں چہ اگلے روز ہم نے عربی میں ایک عرض داشت تیار کی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

''اہل سنت والجماعت کے نزدیک چاروں اِمام (حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ) برحق ہیں، اور اجتہادی مسائل میں اُن کا آپسی اختلاف فروعی اور جزوی ہے، اور اُن میں سے ہر ایک کی رائے محتمل صواب وخطاء ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہے کہ برصغیر ہندوپاک سے آنے والے اکثر حجاج فقہ حنفی پر عامل ہوتے ہیں؛ لیکن اَفسوس کی بات یہ ہے کہ سعودی عرب میں جگہ جگہ منصوبہ بندی کے ساتھ اُن خالی الذہن عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ اَب تک جس مسئلہ پر عمل کرتے رہے وہ غلط تھا، اور اَب ہم جو مسئلہ بتا رہے ہیں وہ صحیح ہے، اور تمہارے علماء نے تمہیں دھوکہ میں رکھا ہے، اِس کی وجہ سے بہت سے عوام اپنے علماء سے بدگمانی بٹھا لیتے ہیں، اور ذہنی اعتبار سے حیران وپریشان ہو جاتے ہیں، ہماری نظر میں یہ عمل اُمت میں انتشار وتفریق کا سبب بن رہا ہے، اور سعودی حکومت کی شبیہ خراب ہو رہی ہے، اور حیرت ہے کہ مسجد نبوی میں ''ریاض الجنۃ'' میں بیٹھ کر اِس طرح کی انتشاری گفتگو کی جاتی ہے، کیا واقعۃً ''**هيئة الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر**'' کی طرف سے اِن نگرانوں کو یہ ہدایات دی گئی ہیں، یا وہ اپنی طرف سے یہ حرکتیں کر رہے ہیں؟''

اور اِس طرح کی مزید کچھ باتیں ہم نے اُس عرض داشت میں شامل کیں۔ اتفاق یہ کہ اُس زمانہ میں ہندوستان کے کئی اہم علماء بھی مدینہ منورہ حاضر تھے، جن میں حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب زیدمجدہم، حضرت مولانا مفتی عبدالرزاق صاحب بھوپالی زیدمجدہم، حضرت مولانا مفتی ابوالکلام صاحب بھوپالی مدظلہ اور کئی حضرات جن کے نام اِس وقت ذہن میں نہیں ہیں، اِن سب حضرات کا ایک وفد بنا کر ہم لوگ مذکورہ عرض داشت کو لے کر ''ہیئۃ الامر بالمعروف'' کے دفتر میں پہنچے، اِدارہ کے رئیس نے (جن کا پورا نام اِس وقت ذہن میں نہیں ہے) نے ہمارا بہت اکرام کیا، احقر نے سب علماء کا تعارف کرایا، اور بتایا کہ یہ سب ہندوستان کے اکابر علماء میں سے ہیں، اور پھر مذکورہ یادداشت موصوف کو پیش کی۔

موصوف نے ہماری درخواست کو بغور پڑھ کر بلا کسی توقف کے جو جواب دیا اُس کا مفہوم یہ تھا کہ:

''سعودی حکومت کے نزدیک یہ تمام مذاہب برحق ہیں، اور حکومت کا موقف یہ ہے کہ فروعی مسائل میں کسی کو مجبور نہ کیا جائے، اور نہ کسی کی تغلیط کی جائے، اور اتحاد کی راہ نکالی جائے، اور تفریق وانتشار سے بچا جائے''۔

پھر ہم نے ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر اختلافی گفتگو کرنے والے نوجوان کا ذکر کیا، تو موصوف نے بہت حیرت کا اظہار کیا، اور کہا کہ یہ ہماری پالیسی کے بالکل خلاف ہے، اور ہم اِس پر کارروائی کریں گے، چناں چہ اُنہوں نے مذکورہ نوجوان کا نام نوٹ کرلیا، اور پھر ہم لوگ مطمئن ہوکر واپس آگئے۔

اِس ملاقات کا اثر یہ ہوا کہ اُس دن مذکورہ نوجوان اپنی ڈیوٹی پر تو آیا؛ لیکن حال یہ تھا کہ چہرہ اُترا ہوا تھا، اور پورے وقت خاموش ہی بیٹھا رہا، اور دو ایک روز کے بعد اُس کی ڈیوٹی ہی بدل دی گئی۔

سعودی حکومت نادان دوستوں سے ہوشیار رہے!

مذکورہ گفتگو تو کسی حد تک اطمینان بخش تھی؛ لیکن بعد کے حالات کے مشاہدہ سے یہ اندازہ ہوا کہ سعودی حکومت کا سبھی مسالک کے احترام کا دعویٰ حقیقت سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے، بلاشبہ حرمین شریفین میں جو مشائخ ومدرسین عربی زبان میں درس دیتے ہیں، اکثر اُن کا انداز خالص علمی باوقار اور مہذب ہوتا ہے، اور وہ اختلاف بھی نقل کرتے ہیں تو ہر ایک کا احترام ملحوظ رہتا ہے؛ لیکن مردوں اور عورتوں کے حصوں میں جو اُردو زبان کے مبلغین وواعظین مقرر ہیں، اُن کا انداز فروعی اِجتہادی مسائل اور ائمہ مجتہدین بالخصوص حضرت اِمام اَبوحنیفہؒ کے بارے میں انتہائی جارحانہ اور غیر مہذب ہوتا ہے، شرک

وبدعت کی تردید کے ساتھ ساتھ وہ تقلید کے خلاف بھی طلاقت لسانی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور اُن کے خاص موضوعات ''قراءت فاتحہ خلف الامام''، ''آمین بالجہر''، ''عورتوں کا طریقۂ سجدہ'' وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور یہ صرف حرمین شریفین تک ہی محدود نہیں؛ بلکہ دیگر مساجد میں بھی خصوصاً حج کے زمانہ میں پرجوش غیر مقلدین وعظ ونصیحت کی آڑ میں بکثرت اختلافی گفتگو کرتے نظر آتے ہیں، اور سعودی حکومت کے شعبۂ وعظ وارشاد میں جو اَجنبی زبانوں کے واعظین مقرر ہیں، اُن کی نامناسب باتیں بھی جابجا انتشار کا سبب بنتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، اِن علمی بحثوں اور اختلافات کو ناواقف عوام کے سامنے پیش کرنے سے انتشار بڑھتا ہے، اور دین کے بارے میں بے اطمینانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر اِن باتوں کا پتہ سعودی حکومت کے ذمہ داروں کو نہیں ہے تو تعجب کی بات ہے، اور اگر معلوم ہونے کے باوجود حکومت کی طرف سے چشم پوشی کی جارہی ہے تو یہ حکومت کے لئے سخت نقصان دہ ہے، فروعی اختلافات کو ہَوا دے کر اور حکومت کے ذمہ داروں کی چاپلوسی کرکے یہ ''انتشار پسند نادان دوست'' پوری دنیا کے مسلمانوں کی نظر میں سعودی حکومت کی ساکھ کو داغ دار بنارہے ہیں۔

جمعہ کی اَذانِ اول کے بارے میں ایک نیا اِقدام

اور اَب ایک نیا عمل یہ شروع ہوا ہے کہ کچھ دنوں سے حرمین شریفین میں جمعہ کی نماز میں اَذانِ اول جمعہ کا وقت شروع ہونے سے پہلے دی جانے لگی ہے، جو حرمین شریفین کے پندرہ سو سالہ تعامل کے قطعاً خلاف ہے، اگر حکومت سعودیہ اپنے اِس دعوے میں سچی ہے کہ وہ سبھی فروعی اختلافات والے مسالک کا احترام کرتی ہے، تو اُسے خصوصاً اجتماعی عبادات میں حتی الامکان ایسی راہ اپنانی چاہئے جس میں کسی مسلک والوں کو اشکال کا کوئی موقع نہ رہے۔

واضح ہو کہ ائمہ اربعہ میں سے صرف حضرت اِمام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ہے کہ جمعہ کا وقت عیدین کی طرح اشراق کے وقت سے ہی شروع ہوجاتا ہے، جب کہ اُن کے علاوہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور علماء اُمت اِس پر متفق ہیں کہ جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے، یعنی زوال (نصف النہار عرفی) کے بعد ہی وقت شروع ہوتا ہے؛ لہٰذا اُن کے نزدیک وقت سے پہلے دی گئی اَذان غیر معتبر ہوگی۔ اور جمہور کا یہ موقف نقلی وعقلی دلائل سے مؤید ہے، اور دورِ نبوت اور دور صحابہ کے تعامل کے موافق ہے، اور حضرت اِمام احمد بن

حنبلؒ نے جن دلائل سے استدلال کیا ہے وہ سب اپنے اندر متعدد احتمالات رکھتے ہیں، خصوصاً عبداللہ بن سیدان الاسلمی والی روایت جہالت کی وجہ سے نا قابل اعتبار ہے۔ (دیکھئے: اعلاء السنن ۸/۵۱ کراچی)

غالباً اِسی بنا پر خود حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے یہ فرمایا ہے کہ زوال سے قبل جمعہ کا صرف وقتِ جواز ہے، وقتِ مستحب زوال کے بعد ہی ہے۔ اور فقہ حنبلی کے مشہور عالم علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''المغنی'' میں اِس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہوئے صرف اِسی پہلو کو اُجاگر کیا ہے کہ مستحب یہی ہے کہ جمعہ زوال کے بعد ادا کیا جائے؛ تاکہ کسی کو اختلاف نہ ہو۔ موصوف کی عبارت درج ذیل ہے:

اَلْمُسْتَحَبُّ إِقَامَةُ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الزَّوَالِ؛ لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ، قَالَ سَلَمَةُ ابْنُ الْأَكْوَعِ: كُنَّا نُجَمِّعُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ ثُمَّ نَرْجِعُ فَنَتَّبِعُ الْفَيْءَ. (متفق عليه) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي الْجُمُعَةَ حِيْنَ تَمِيْلُ الشَّمْسُ. (أخرجه البخاري) وَلِأَنَّ فِيْ ذٰلِكَ خُرُوْجًا مِنَ الْخِلَافِ؛ فَإِنَّ عُلَمَاءَ الْأُمَّةِ اتَّفَقُوْا عَلٰى أَنَّ مَا بَعْدَ الزَّوَالِ وَقْتٌ لِلْجُمُعَةِ، وَإِنَّمَا الْخِلَافُ فِيْ مَا قَبْلَهُ. (المغني لابن قدامة ۲/۷۰ دار الفكر بيروت)

جمعہ کو زوال کے بعد ہی قائم کرنا مستحب ہے؛ اس لئے کہ یہی نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معمولِ مبارک تھا۔ حضرت سلمہ ابن الاکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ زوالِ شمس کے بعد نماز جمعہ ادا کرتے تھے، پھر ہم سایہ تلاش کرتے ہوئے لوٹتے تھے۔ (یہ بخاری مسلم کی حدیث ہے) اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سورج ڈھلنے کے وقت نماز جمعہ پڑھتے تھے۔ (یہ بخاری کی روایت ہے) اور اِس لئے کہ زوال کے بعد نماز پڑھنے میں اختلاف سے نکلنا بھی پایا جاتا ہے؛ کیوں کہ تمام علماء زوال کے بعد جمعہ کا وقت ہونے پر متفق ہیں، جو کچھ بھی اختلاف ہے وہ زوال سے پہلے کے بارے میں ہے۔

اور فقہ شافعی کے مشہور عالم اور محدث علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں تحریر فرمایا ہے:

وَقَدْ قَالَ مَالِكٌ وَأَبُوْ حَنِيْفَةَ وَالشَّافِعِيُّ

اور امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور صاحبہ،

وَجَمَاهِيْرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ، وَمَنْ بَعْدَهُمْ: لَا تَجُوْزُ الْجُمُعَةُ إِلَّا بَعْدَ زَوَالِ الشَّمْسِ، وَلَمْ يُخَالِفْ فِيْ هٰذَا إِلَّا أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَإِسْحٰقُ فَجَوَّزَاهَا قَبْلَ الزَّوَالِ، قَالَ الْقَاضِيْ وَرُوِيَ فِيْ هٰذَا أَشْيَاءَ عَنِ الصَّحَابَةِ لَا يَصِحُّ مِنْهَا شَيْءٌ إِلَّا مَا عَلَيْهِ الْجُمْهُوْرُ، وَحَمَلَ الْجُمْهُوْرُ هٰذِهِ الْأَحَادِيْثَ عَلَى الْمُبَالَغَةِ فِيْ تَعْجِيْلِهَا. (نووي على مسلم ۲۸۳/۱، ومثله في إعلاء السنن ۵۱/۸، الفقه على المذاهب الأربعة ۲٤٥/۲)

تابعین اور اُن کے بعد آنے والے جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ زوال کے بعد ہی جائز ہے، اور اِس بارے میں صرف اِمام احمد بن حنبلؒ اور اور امام اسحٰق بن راہویہ نے اختلاف کیا ہے، پس اُنہوں نے زوال سے پہلے بھی جمعہ کو جائز قرار دیا۔ اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں صحابہ سے کچھ باتیں مروی ہیں، جن میں سے صرف وہی باتیں صحیح ہیں جو جمہور کے موافق ہیں۔ اور جمہور نے دیگر روایتوں کو جمعہ جلدی پڑھنے میں مبالغہ پر محمول کیا ہے۔

درج بالا حوالوں سے معلوم ہوا کہ جمہور کے نزدیک جب زوال سے پہلے جمعہ کا وقت ہی شروع نہیں ہوتا تو جمعہ کی اذان کیسے معتبر ہوسکتی ہے؟ اور حنابلہ کے نزدیک بھی وقت مستحب زوال کے بعد ہی ہے، اِس لئے آخر کس مصلحت سے اِس استحباب کو چھوڑ کر محض جواز پر عمل کیا جارہا ہے، یہ بات نا قابل فہم ہے۔ اِس عمل کی بناپر جمہور کے اعتبار سے ایک سنتِ مؤکدہ کا ترک لازم آرہا ہے، جو یقیناً قابل اِشکال ہے۔

اِس لئے ہر علاقہ کے ذمہ دار حضرات کو چاہئے کہ وہ سعودی حکومت کے اربابِ حل وعقد کو اِس طرح کے مسائل ومعاملات میں معقول رویہ اختیار کرنے کی تلقین کریں، اور حرمین شریفین کو حتی الامکان مسلکی تعصب کا مرکز نہ بننے دیں، ورنہ مسلمانوں کی رائے عامہ حکومت سعودیہ کے مزید خلاف ہوجائے گی۔

نائیلون کے باریک موزوں پر مسح کا مسئلہ

اِسی طرح ایک قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک صرف چمڑوں کے موزوں یا دبیز موزوں پر حسبِ شرائط مسح کی اجازت ہے، اور آج کل جو نائیلون کے

باریک موزے چل رہے ہیں، اُن پر مسح کرنے سے وضو درست نہیں ہوتا؛ لیکن جمہور ائمہ سے ہٹ کر علامہ ابن تیمیہؒ اور اُن کے شاگردوں نے اِس طرح کے باریک سوتی یا نائیلون کے موزوں پر مسح کے جواز کا قول کیا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲۱/۲۱۳-۲۱۴)

یہ اُن حضرات کا قیاس اور ذاتی تفرد ہے۔ سلفِ صالحین سے اِس کی تائید نہیں ملتی؛ لیکن اِس کے باوجود سلفیت کے دعوے دار عوام وخواص میں باریک موزوں پر مسح کرنے کا رواج عام ہوگیا ہے۔

اور یہ معلوم ہوکر مزید تشویش ہے کہ بہت سی مساجد کے ائمہ بھی ایسے موزوں پر مسح کر کے بلا تکلف نماز پڑھادیتے ہیں، جس سے مقتدیوں کی نماز خطرہ میں پڑ جاتی ہے، یقیناً یہ طریقہ احتیاط کے خلاف ہے۔ بالخصوص ائمہ حرمین شریفین کو تو اِس بارے میں مزید احتیاط کرنی چاہئے؛ کیوں کہ خود علامہ ابن تیمیہؒ نے نصیحت کی ہے کہ دینی معاملات میں جوڑ برقرار رکھنے کے لئے مستحبات کو ترک کردینا چاہئے۔ موصوف کا اِرشاد ہے:

يَسْتَحِبُّ لِلرَّجُلِ أَنْ يَقْصِدَ إِلىٰ تَالِيْفِ الْقُلُوْبِ بِتَرْكِ هٰذِهِ الْمُسْتَحَبَّاتِ؛ لِأَنَّ مَصْلَحَةَ التَّالِيْفِ فِي الدِّيْنِ أَعْظَمُ مِنْ مَصْلَحَةِ فِعْلِ مِثْلِ هٰذَا. (مجموعة فتاوىٰ ابن تيمية ٢٢/٤٠٦، معالم ارشاديه)

آدمی کے لئے بہتر ہے کہ وہ مستحبات کے بجائے لوگوں کے دلوں کو جوڑنے والی بات پر عامل ہو؛ اِس لئے کہ دین کے بارے میں لوگوں کے دلوں کو جوڑے رکھنا بہت سے مستحبات کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ ہے۔

تو جب تالیفِ قلب کے لئے مستحبات کو چھوڑا جاسکتا ہے تو جہاں جواز وعدم جواز کا معاملہ ہو، وہاں تو دوسری رائے کا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے، بالخصوص کسی شاذ رائے پر ہرگز مدار نہیں رکھنا چاہئے۔

موجودہ حالات میں جب کہ سعودی حکومت ہر چہار جانب سے اپنوں اور غیروں کی فتنہ سامانیوں میں گھری ہوئی ہے، اُس کے لئے کسی بھی ایسے عمل کو جاری کرنا مناسب نہیں ہے جس سے مخالفین کو اُس کے خلاف رائے عامہ بنانے کا بہانا ہاتھ آئے، اور خاص کر حکومت سعودیہ کو اِن نام نہاد نادان دوستوں سے ضرور ہوشیار رہنا چاہئے، جو سلفِ صالحین کا نام لے کر اُمت کو سلف سے دور کرنے کی کوششوں میں برابر مشغول ہیں، **اللّٰهم احفظنا منهم**۔

❍❖❍

درسِ حدیث:

دنیا اور آخرت کے فرق کو پہچانئے!

حضرت مولانا اشہد رشیدی صاحب مہتمم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

عَنْ عَمْرٍو رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ يَوْمًا، فَقَالَ فِيْ خُطْبَتِهٖ: أَلاَ إِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ، يَأْكُلُ مِنْهُ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ، أَلاَ وَإِنَّ الْآخِرَةَ أَجَلٌ صَادِقٌ وَيَقْضِيْ فِيْهَا مَلَكٌ قَادِرٌ، أَلاَ وَإِنَّ الْخَيْرَ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ، أَلاَ وَإِنَّ الشَّرَّ كُلَّهٗ بِحَذَافِيْرِهٖ فِي النَّارِ، أَلاَ فَاعْمَلُوْا وَأَنْتُمْ مِنَ اللّٰهِ عَلٰى حَذَرٍ، وَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ مُعْرَضُوْنَ عَلٰى أَعْمَالِكُمْ، فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهٗ. (شعب الإيمان، مشكوة: ٤٤٥)

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے ایک دن تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: دنیا محسوس ہونے والا (نظر آنے والا) مال ہے، اس میں سے نیک و بد دونوں کھاتے ہیں، باخبر رہو کہ آخرت متعینہ مدت کے بعد آنے والی چیز ہے جس کا سچا وعدہ کیا گیا ہے، اس میں قدرت وطاقت رکھنے والا مالک فیصلہ کرے گا، خبردار رہو کہ ہر طرح کی خوبی صرف جنت میں ہے، باخبر رہو کہ ہر طرح کی برائی جہنم میں ہے، خبردار اللہ رب العزت سے ڈرتے ہوئے نیکیوں کو انجام دیتے رہو، جان لو کہ تم کو اپنے اعمال کا سامنا کرنا پڑے گا، چنانچہ جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

تشریح:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی حقیقت سے امت کو مختلف انداز سے باخبر کرتے رہے، کبھی موت کی یاد دلا کر دنیا کی بے رغبتی دلوں میں اتارنے کی کوشش فرماتے اور کبھی آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کو سوارنے کی طرف متوجہ کرنے کی جدوجہد کرتے اور ہمیشہ اس تگ ودو میں لگے رہتے کہ کسی طرح امت دنیا کے دھوکہ میں اور شیطان کے چنگل میں پھنسنے سے بچ جائے، مذکورہ بالا روایت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں آپ دنیا وآخرت اور خیر وشر سے متعلق چھ باتیں ارشاد

فرمارہے ہیں۔قارئین کرام کے فائدہ کے لئے ذیل میں قدرے وضاحت کے ساتھ ان کو پیش کیا جاتا ہے:

(۱) **أَلاَ إِنَّ الدُّنْيَا عَرَضٌ حَاضِرٌ**: نبی کریم علیہ السلام نے دوران تقریر دنیا کی نا پائیداری کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دنیا ایسا مال ہے جو سامنے ہے، نظر آرہا ہے، جس کی وجہ سے لالچ اور دھوکہ میں مبتلا ہوکر لوگ اس کی طرف دوڑتے ہیں، اس کو اہمیت دیتے ہیں اور دل وجان سے اس کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد میں لگ جاتے ہیں، حالانکہ رب ذوالجلال کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اسی وجہ سے نیک وبد اپنے اور پرائے دوست اور دشمن سب اس سے فیض یاب ہوتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں نبی کریم علیہ السلام دنیا کی بے وقعتی کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت کی نظر میں دنیا مچھر کے پر سے زیادہ بے حیثیت ہے، اگر مچھر کے پر کے برابر بھی اس کی حیثیت خدا کی نظروں میں ہوتی تو کافروں کو ایک گھونٹ پانی نصیب نہ ہوتا۔ارشاد نبوی ﷺ ہے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحُ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً.	حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر دنیا کی قدر اللہ رب العزت کے یہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔

(رواه الترمذي، مشكوة: ٤٤١)

اس کے برخلاف اللہ کے نزدیک چونکہ آخرت اور اس کی نعمتوں کی بڑی قدر و قیمت ہے؛ اس لئے کفار کو وہاں کھانے کا ایک لقمہ اور پانی کا ایک گھونٹ بھی عطا نہیں کیا جائے گا، چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت میں اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو اہل جہنم جنتیوں کو پکار کے کہیں گے کہ کھانے پینے کی نعمتوں میں سے کچھ ہم کو بھی دے دو، پانی کے چند گھونٹ اور کھانے کی کچھ اشیاء ہماری طرف بھی اچھال دو، تو جتنی جواب میں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں کافروں پر حرام کردی ہیں، یعنی آخرت کی عظیم الشان نعمتوں کے مستحق اللہ کو ماننے والے اور اس کی خدائی کو تسلیم کرنے والے ہی ہوں گے۔ارشاد باری ہے:

وَنَادٰى اَصْحَابُ النَّارِ اَصْحَابَ الْجَنَّةِ	دوزخی جنتیوں کو پکار کے کہیں گے کہ ہم پر تھوڑا سا

اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِيْنَ. (الأعراف: ٥٠)

پانی بہادو یا اس روزی میں سے کچھ ہم کو بھی دے دو جو اللہ نے تم کو دی ہے، جنتی کہیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کے لئے حرام کردی ہیں۔

لہٰذا نقد نفع کے چکر میں آکر دنیا کو دل سے لگانے والے نقصان ہی میں رہیں گے اور حلال وحرام کے فرق کو پس پشت ڈال کر ایسی دولت وثروت کے پیچھے دوڑ لگانے والے جس کی کوئی قدر و قیمت رب ذو الجلال کی نظروں میں نہ ہو دونوں جہاں کی ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پائیں گے۔

(۲) **أَلَا وَإِنَّ الْآخِرَةَ أَجَلٌ صَادِقٌ**: نبی کریم علیہ السلام آخرت کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمارہے ہیں کہ تم اپنے ذہن ودماغ میں یہ بٹھا لو کہ اللہ کی طرف سے متعین کردہ وقت پر قیامت ضرور آئے گی اور ہم میں سے ہر ایک کو آخرت میں منتقل ہونا پڑے گا، جہاں نعمتیں بھی ہماری منتظر ہیں اور طرح طرح کے عذاب بھی موجود ہیں، آخرت اگر چہ بمقابلہ دنیا کے تمہاری نظروں کے سامنے نہیں ہے؛ لیکن ہرگز دھوکہ میں مبتلا نہ ہونا، آخرت کی تیاری کرتے رہنا، غفلت، سستی، کاہلی اور طمع ولالچ کے چلتے اس کو نظر انداز نہ کر بیٹھنا؛ کیوں کہ اس کا آنا یقینی ہے اور کسی بھی انسان کا آخرت سے بچ نکلنا ناممکن ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ اَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا. (سورة مريم: ٩٤-٩٥)

اس نے انسانوں کی گنتی کر رکھی ہے، ہر ایک اس کے پاس قیامت کے دن تن تنہا آئے گا۔

گویا نہ کوئی جائے پناہ ہوگی اور نہ کوئی حامی وناصر ہوگا، وہاں صرف خدا کا حکم چلے گا اور ہر ایک کو اس کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے کئے کا حساب دینا ہوگا؛ اس لئے دنیا کی شکل میں نظر آنے والے مال واسباب کے دھوکہ میں پھنس کر نظروں سے پوشیدہ آخرت کی نہ ختم ہونے والی نعمتوں کو ضائع کرنا ایسی ناسمجھی ہے کہ جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے وہ کم ہے۔

آج کل لوگ آخرت اور اس کی نعمتوں کو بھول کر نقد کے چکر میں پھنس رہے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے جائز وناجائز ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، دلوں میں نہ خوف خدا باقی رہ گیا ہے اور نہ قیامت کے دن مالک حقیقی کے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر ہے، حالانکہ اس دن نہ کوئی

سفارشی ملے گا اور نہ کوئی مددگار ہی سامنے آئے گا، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ. (سورة البقرة: ٤٨)

ڈرو اس دن سے کہ جس میں کوئی آدمی کسی کی طرف سے کام نہیں آئے گا، نہ کسی کی طرف سے بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ سفارش کام آئے گی اور نہ ان کو کسی کی مدد پہنچے گی۔

(۳) أَلَا وَاِنَّ الْخَيْرَ كُلَّهٗ : نبی کریم علیہ السلام تیسرے نمبر پر جنت کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمارہے ہیں کہ جان لو کہ ہر طرح کی خیر سکون عافیت اور کامیابی صرف اور صرف جنت میں ہے، جس کو جنت مل گئی اس کو سب کچھ مل گیا، اب اس کو نہ کوئی دکھ ہوگا اور نہ کوئی غم، نہ کوئی تکلیف ہوگی اور نہ کوئی فکر، وہ تو ہر وقت اپنے رب کی لازوال نعمتوں سے سرشار ہوتا رہے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں اللہ رب العزت جنتیوں کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ الَّذِىْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ. (سورة الفاطر: ٣٤-٣٥)

(جنتی) کہیں گے کہ تمام تعریفیں اس رب کی ہیں کہ جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا ہے، اور ہم کو ہمیشہ باقی رہنے والے گھر یعنی جنت میں داخل کر دیا جہاں ہم کو نہ کوئی مشقت ہے اور نہ کوئی تھکن۔

الغرض دنیا کی راحتوں کے حصول میں لگ کر اپنی زندگی کو ضائع نہ کرو؛ کیوں کہ یہاں کی ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جانے والی ہے؛ بلکہ اخروی نعمتوں اور جنت کے چین وسکون کو حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگو اور ہرگز اس کی طرف سے غفلت نہ برتو؛ کیوں کہ وہاں کی نعمتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی؛ بلکہ ہمیشہ باقی رہیں گی۔

(٤) أَلَا وَاِنَّ الشَّرَّ كُلَّهٗ : نبی کریم علیہ السلام چوتھے نمبر پر دوزخ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمارہے ہیں کہ جان لو ہر طرح کی برائی، پریشانی، مصیبت اور عذاب جہنم میں موجود ہے، جس کو جہنم میں پہنچا دیا گیا، اس کو آفتوں میں ڈھکیل دیا گیا، جہاں نہ پانی ہوگا، نہ کھانا، نہ نیند ہوگی نہ آرام، نہ فرار کی راہ ہوگی اور نہ بچنے کا کوئی راستہ، نہ عذاب الٰہی سے چھٹکارا ملے گا اور نہ اس میں کوئی کمی ہوگی،

چنانچہ ایک آیت میں اللہ رب العزت دوزخیوں کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: کہ جہنمی دوزخ کے داروغہ سے کہیں گے کہ اپنے رب سے سفارش کرو کہ کم سے کم (ہفتہ میں) ایک ہی دن کے لئے عذاب میں کمی کردیا کرے تو وہ ان کو جھڑکتے ہوئے کہے گا کہ کیا تم کو راہ حق دکھانے کے لئے انبیاء اور رسول نہیں پہنچے تھے، جہنمی جواب میں کہیں گے کہ آئے تھے مگر ہم ان کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے رہے، اس کے بعد ان کا چیخنا، چلانا، ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا، ارشاد ربانی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِيْ النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِنَ الْعَذَابِ قَالُوْا اَوَ لَمْ تَكُ تَأْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوْا بَلیٰ قَالُوْا فَادْعُوْا وَمَا دُعَآءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ. (سورة الغافر: ٤٩-٥٠)

جو جہنم میں پڑے ہوں گے وہ دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے کہو کہ ایک دن عذاب ہلکا کردیا کرے، جہنم کے پہرے دار کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے، واضح نشانیاں لے کر، وہ کہیں گے کہ کیوں نہیں رسول آئے تھے، پہرے دار کہیں گے کہ پکارو، کافروں کی چیخ و پکار بے فائدہ ہی ہے۔

گویا اس تباہی و بربادی کے مقام سے ہر ایک کو بچنے کی کوشش بھرپور انداز سے زندگی بھر کرتے رہنی چاہئے۔ اللّٰھم احفظنا منہ۔

(۵) **أَلاَ فَاعْمَلُوْا وَاَنْتُمْ مِنَ اللّٰهِ عَلیٰ حَذَرٍ**: نبی کریم علیہ السلام پانچویں ہدایت دیتے ہوئے ارشاد فرمارہے ہیں کہ تمہاری کامیابی کی ایک ہی شکل ہے کہ تم نیکیوں کو انجام بھی دیتے رہو اور خدا سے ڈرتے بھی رہو، تمہارے دلوں میں ہر وقت یہ خوف ہونا چاہئے کہ معلوم نہیں ہماری عبادات قبول بھی ہوں گی یا رد کردی جائیں گی، یقیناً رب ذوالجلال کی شان بڑی اونچی اور عظمت والی ہے، ہمارے اعمال کہاں اس قابل ہیں کہ وہ خدا کے دربار میں قبولیت کے درجہ کو پہنچ سکیں، اگر وہ محض اپنے فضل و کرم سے ہماری ناقص اور ٹوٹی پھوٹی عبادات کو قبول فرمالے تو یہ اس کا احسان و کرم ہوگا۔

آج کل لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر بفضل خداوندی نیکیوں کو انجام دینے کی توفیق ہوگئی تو اترانے لگتے ہیں، دوسروں کو گری ہوئی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور اپنی مغفرت کی طرف سے بالکل بے فکر

ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہماری مغفرت تو ہو ہی چکی ہے، اب ہمیں دوسروں کی فکر کرنی چاہئے، یہ سوچ انسان کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے، غرور وتکبر اور خوف خدا سے دل کے خالی ہونے کی وجہ سے نیکیاں اکارت ہوجاتی ہیں؛ اس لئے نبی کریم علیہ السلام امت کو متنبہ فرمارہے ہیں کہ اعمال صالح کو انجام بھی دیتے رہو اور خدا کے خوف سے اپنے قلوب کو منور بھی کرتے رہو؛ کیوں کہ اللہ کے نیک اور صالح بندوں کی یہی صفت ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (سورة السجدة: ١٦)

وہ لوگ اپنے رب کو ڈر اور امید کی حالت میں پکارتے ہیں (نیکیوں کو انجام دیتے ہوئے ڈرتے بھی رہتے ہیں اور اس کی امید بھی کرتے رہتے ہیں کہ خدا ان کی حقیر سی عبادات کو قبول کرلے گا) اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔

(٦) وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُعْرَضُوْنَ: نبی کریم علیہ السلام چھٹی بات کو ذکر کرکے ارشاد فرما رہے ہیں کہ جان لو کہ تم میں سے ہر ایک کو اپنے اعمال کا سامنا کرنا پڑے گا، خدا کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں، جو انسان کی نیکیوں کو بھی لکھ رہے ہیں اور گناہوں کو بھی ضبط تحریر میں لا رہے ہیں، گویا انسان کا پورا بایو ڈاٹا تیار ہورہا ہے، جس میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر طرح کے اعمال درج کردئے جائیں گے، جس کا ہر انسان مشاہدہ کرے گا، اگر اچھے کام کرکے انسان گیا ہوگا تو وہاں اپنی نیکیوں کو دیکھ کر خوش ہوگا اور اگر برے کام کرکے دنیا سے گیا ہے تو اپنے گناہوں کو دیکھ کر پچتائے گا، مگر اس دن کا پچتانا کسی کے کام نہیں آئے گا؛ اس لئے ہر شخص نیکیوں کو انجام دے اور گناہوں سے بچے، تاکہ کل میدان محشر میں شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اللہ رب العزت ہم سب کو نبی کریم علیہ السلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْكَرِيْم.

❍❖❍

اِفاداتِ قرآنیہ:

اِفادات: سورۂ والنجم

افادات: عارف باللہ حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نوراللہ مرقدہٗ

ضبط وترتیب: حضرت مولانا مفتی محمد زید صاحب مظاہری ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مدنیؒ کی تھانہ بھون میں تشریف آوری کا پر لطف واقعہ

حضرت تھانوی اور حضرت مدنی رحمہما اللہ کے نظریات میں شدید اختلاف تھا؛ لیکن دونوں ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے، دونوں ایک دوسرے سے کس قدر محبت وعظمت سے پیش آتے تھے، دونوں میں کیسا تعلق اور کیسی محبت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اُن کے شاگرد ہیں، اور وہ اُن کے شاگرد ہیں، یہ اُن کے پیر ہیں اور وہ اُن کے پیر ہیں، اِس قدر دونوں ایک دوسرے کی تعظیم کرتے تھے، یہی چیزیں بڑوں سے سیکھنے کی ہوتی ہیں۔

حضرت مدنیؒ جب ملاقات کے لئے تھانہ بھون تشریف لے گئے، اُس وقت مجلس لگی ہوئی تھی، کسی نے اطلاع دی تو حضرت تھانویؒ مجلس سے اُٹھ کر استقبال کے لئے تشریف لے گئے، اپنی مسند چھوڑ کر حضرت مدنیؒ کو اُس جگہ بٹھایا، اور بے تکلفی سے عرض کیا کہ حضرت کھانا تازہ پکواؤں یا جو رکھا ہوا ہے جلدی سے وہی لے آؤں؟ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ جو رکھا ہے وہی لے آیئے، حضرت تھانویؒ نے پوچھا کہ آپ کو کھانے میں کیا شئ مرغوب ہے؟ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ مرغوب تو روٹی اور شلجم کا اچار ہے، چناں چہ حضرت تھانویؒ نے روٹی کے ساتھ شلجم کا اچار منگایا اور کھانا کھایا گیا، کھانے کے بعد حضرت تھانویؒ نے ایک عمامہ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کیا، حضرت مدنی نے فرمایا کہ حضرت آپ جانتے ہیں کہ ترکِ موالات کی وجہ سے میں ولایتی کپڑا نہیں استعمال کرتا، اور لوگوں کو بھی اِس سے منع کرتا ہوں، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں بھول گیا تھا، پھر دوسرا گاڑھے کا عمامہ منگوایا، حضرت مدنیؒ نے اُس کو قبول فرمایا اور کہا کہ حضرت ہی اِس کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیں، چناں چہ حضرت تھانویؒ نے اپنے ہاتھ سے حضرت مدنیؒ کے سر پر وہ عمامہ باندھا، اِس کے بعد حضرت مدنیؒ رخصت ہوگئے، حضرت تھانویؒ اُن کو

رخصت کرنے کے لئے باہر تک تشریف لائے۔

اِس کے بعد حضرتؒ نے اُن کی خبر لی، جنہوں نے کہا تھا کہ مولوی نور محمد ٹانڈوی آرہے ہیں (یعنی حضرت مدنیؒ کا نام بے وقعتی سے لیا تھا) حضرت تھانویؒ نے تنبیہ کے طور پر اُن کو مجلس سے کان پکڑ کر نکال باہر کیا کہ بزرگوں کی شان میں گستاخی کرتے ہو۔

یہ ہیں ہمارے اَکابر اور یہ ہے ہمارے اَکابر کی مجلس کا حال؛ لیکن افسوس کہ آج اُنہیں اکابر کے ماننے والے انہیں اکابر ہی کے نام پر آپس میں اختلاف کرتے ہیں، ایک دوسرے سے ملنا پسند نہیں کرتے، برائی سے تذکرہ کرتے ہیں، ہمارے اکابر نے تو سیاسی اور نظریاتی اختلاف کے باوجود اِس قدر ایک دوسرے کا اکرام واحترام کرکے دکھادیا، ہم کو بھی تو اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔

زمانۂ طالب علمی میں حضرتؒ کا فضول باتوں سے احتراز اور علمی انہماک

درسِ قرآن ختم ہو چکا تھا، مجلس کی مناسبت سے حضرتؒ نے اپنی زمانۂ طالب علمی کا حال سنایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ زمانۂ طالب علمی ہی سے اللہ نے فضول باتوں سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائی، ایسی مشغولی رہتی تھی کہ ایک منٹ کیا ایک سیکنڈ ضائع نہیں ہوتا تھا، پوری زمانۂ طالب علمی میں ڈیڑھ دو گھنٹہ سے زیادہ نہیں سویا، پانی پت میں جب پڑھتا تھا اُس وقت بھی ڈیڑھ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ سوتا تھا۔ سہارنپور کی زمانۂ طالب علمی میں بھی یہی حال رہا کہ مشکل سے دو گھنٹہ سونے کو ملتا تھا، میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔

میرے ایک ساتھی مولانا جامیؒ صاحب تھے، اُن کا بھی حال یہی تھا، مدرسہ سے باہر نکلنا ہی نہ ہوتا تھا، کبھی کبھی ہم لوگ کسی ضرورت سے مدرسہ سے باہر جاتے تو لوگ بڑے تعجب کی نگاہ سے دیکھتے کہ کیا بات ہے؟ آج یہ لوگ باہر کیوں نکلے ہیں؟ کوئی خاص بات ہے، میرے ایک ساتھی نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ صدیق! خدا کی قسم اگر ہم لوگ قسم کھالیں کہ دن بھر میں ایک بات بھی فضول نہیں کرتے، تو انشاءاللہ حانث نہ ہوں گے، وہ اپنے کام میں لگے رہتے، میں اپنے کام میں لگا رہتا، ایک ہی کمرہ میں ساتھ رہتے تھے، وہی عادت اب تک پڑی ہوئی ہے کہ ایک منٹ بھی ضائع ہونا گوارہ نہیں ہوتا، میں اپنا ایک ایک منٹ بچاتا ہوں، بسا اوقات ضروری کام کی وجہ سے پیشاب پاخانہ تک روکے رہتا ہوں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا حال

میں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے حالات میں سنا ہے کہ وقت کی قلت کی وجہ سے شام کا کھانا نہیں کھاتے تھے، اُن کی بہن اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دیا کرتی تھیں؛ لیکن جب اُن کا انتقال ہوگیا تو پھر شام کا کھانا ہی چھوڑ دیا، اُس وقت تو سن کر مجھے تعجب ہوتا تھا؛ لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی ایسی مشغولی ہی رہی ہوگی، جس میں کھانے کی بھی فرصت نہ ملتی ہوگی، خود میرے ساتھ اب یہی معاملہ ہے، بسا اوقات مجھے کھانا کھانے کا وقت نہیں ملتا، مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ مجھے کوئی اپنے ہاتھ سے کھلائے؛ لیکن مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔

احقر راقم الحروف حضرت کا خادم عرض کرتا ہے کہ بکثرت ایسا ہوا کہ حضرت سفر سے واپس تشریف لائے، بھوکے بھی ہیں اور سبق پڑھانے کے لئے فوری مطالعہ بھی کرنا ہے، جلدی سے گھر سے کھانا منگایا، کتاب ہاتھ میں ہے، مطالعہ میں مصروف ہیں، فوراً سبق پڑھانا ہے، کھانا کھانے کا وقت ہی نہیں، ایسے وقت خود احقر نے بھی کئی مرتبہ حضرت کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا ہے، حضرت کی نگاہیں کتاب پر رہتیں اور احقر لقمہ لے کر منہ کے پاس لے جاتا، حضرت منہ کھولتے منہ میں رکھ دیتا، بس ڈیڑھ دو چپاتی کھا لیتے اور پڑھانے چلے جاتے، مہمانوں کا ہجوم ہوتا، تعویذ وغیرہ مختلف اغراض سے لوگ آتے، اُن کا کام سبق پڑھانے کے بعد کرتے، اتنے میں نماز کا وقت ہوجاتا یا دوسری جماعت سبق پڑھنے کے لئے آجاتی، اور بھی دوسرے اہم کام سامنے آجاتے، کھانے اور آرام کا وقت مشکل ہی سے ملتا تھا۔

حضرت نے فرمایا کہ مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے جب میں کسی کو دیکھتا ہوں کہ فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، کیا ان لوگوں کے پاس کچھ کام ہی نہیں، ارے تھوڑی سی زندگی ہے کچھ کمالیں۔

حضرتؒ کی زمانۂ طالب علمی کا حال

پانی پت کے زمانۂ طالب علمی میں میرے ایک استاذ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ تھے، فن قرأت کی کتابیں ''تیسیر'' وغیرہ میں نے انہیں سے پڑھی ہیں، اور اسی وقت میں قدوری، کافیہ وغیرہ بھی پڑھا کرتا تھا؛ لیکن قرأت تو مدرسہ میں پڑھتا تھا، اور قدوری کافیہ وغیرہ پڑھنے کے لئے ایک میل دور جانا پڑتا تھا، اس وقت بھی ڈیڑھ دو گھنٹہ سے زائد نہ سوتا تھا، فجر سے پہلے قرأت کا سبق ہوتا تھا، اس میں شریک

ہوتا اور فجر کے بعد ایک میل دور پیدل جا کر وہاں کچھ اسباق پڑھتا، پھر وہاں سے پیدل واپس آتا، اس طرح دن میں کئی چکر لگ جاتے، اچھا خاصا وقت تو اسی میں خرچ ہو جاتا؛ لیکن میں اس وقت کو بھی ضائع نہ کرتا، ساتھ میں کتاب لے کر چلتا اور بھرے مجمع میں بھی راستہ میں کتاب دیکھتا مطالعہ کرتا جاتا تھا، احتیاط سے چلتا تھا۔ میرے اُستاذ سمجھتے تھے کہ یہ بڑا محنتی ہے، قرأت کا سبق دن میں کئی مرتبہ ہوتا تھا، اس لئے جلدی آنا پڑتا تھا، اور اس کی تیاری بھی کرنی پڑتی تھی، میرے اُستاذ مولانا عبدالحلیم صاحب (اللہ اُن کو غریق رحمت کرے) میری بہت رعایت کرتے تھے، اور لوگ تو سبعہ دوسروں سے لکھوا لیتے تھے، اس زمانہ میں قرأتِ سبعہ کی لکھوائی پانی پت میں ایک صفحہ پانچ روپئے کی ہوتی تھی، اور میرے پاس خدا کی قسم پانچ پیسے بھی نہ ہوتے تھے، اس لئے میں خود ہی اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا، میرے اُستاذ فرماتے تھے کہ جتنا صدیق لکھے گا اتنا ہی سبق ہوگا، مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے، میرے حالات بھی اُن کو معلوم تھے، سارے طلبہ چاہتے تھے کہ سبق زیادہ سے زیادہ ہو، اسی وجہ سے میں زیادہ لکھتا تھا کہ کہیں طلبہ یہ نہ کہیں کہ اس کی وجہ سے سبق کم ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے رات کو ڈیڑھ دو گھنٹہ سے زیادہ سونے کا موقع نہ ملتا تھا، پھر عادت بن گئی، سر میں درد ہونے لگا تھا؛ لیکن اس حال میں بھی پڑھتا رہتا تھا۔ مغرب سے عشاء تک قرأتِ سبعہ کی تیاری میں لگا رہتا اور پوری دوپہر بھی اسی میں گذر جاتی تھی، فضول باتوں اور سیر وتفریح کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔

نگرانی اس کو کہتے ہیں اور اس کا نام ہے تربیت

ایک مرتبہ بڑی شدت کی گرمی تھی، مارے گرمی کے سب بلبلا گئے، نہ لکھنے میں جی لگے نہ پڑھنے میں، میرے ایک ساتھی عبدالرحیم علی گڈھ کے رہنے والے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ چلو صدیق ٹہلنے چلیں بہت گرمی ہے، بہت اصرار کیا، گرمی بھی شدید تھی ٹہلنے چلا گیا، جی ٹی روڈ وہاں سے نکلا ہوا ہے، کھلی فضا میں اچھی ہوا آرہی تھی، اس لئے ٹہلنے چلا گیا، دوسرے ہی روز مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ صدیق کل کہاں جارہے تھے؟ پاؤں تلے زمین نکل گئی، ہر وقت نگرانی فرماتے تھے، وہی ٹہلنے کا پہلا دن تھا، اور وہی آخری دن، معلوم ہوتا تھا کہ اُنہوں نے جاسوس لگا رکھے ہیں کہ صدیق کس وقت کیا کر رہا ہے؟ ہر وقت دیکھا کرتے اور فکر رکھتے تھے، اس کا نام ہے شفقت اور اس کو کہتے ہیں تربیت۔ طلبہ اَمانت ہوتے ہیں، اَمانت میں خیانت نہ ہونا چاہئے، یہ اُن کے ساتھ خیانت ہے کہ اُن کو آزاد چھوڑ دیا جائے، جس طرح بھی

طلبہ کی اصلاح ہوسکتی ہو اُس میں کسر نہ اُٹھا رکھی جائے، مجھ سے مولانا نے پوچھا کہ صدیق کل کہاں گئے تھے؟ ٹہلنے گئے تھے؟ میں نے صاف صاف بتلا دیا کہ جی ٹہلنے گیا تھا، گرمی شدید تھی، عبدالرحیم اصرار سے لے گیا تھا، فرمایا کہ تم سچے ہو اِس لئے کچھ نہیں کہتا، ہوسکتا ہے قصداً لے گیا ہو، آئندہ خیال رکھنا، میں نے کہا حضرت کان پکڑتا ہوں، آئندہ کبھی نہیں جاؤں گا، کل کا دن ہی پہلا دن تھا اور وہی آخری دن، اس کے بعد کبھی ٹہلنے نہیں گیا، نگرانی اور تربیت تو ایسے ہوتی ہے، میرے اُستاذوں کی شفقت اور اُن کی تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج اللہ تعالیٰ نے کچھ کام کی توفیق نصیب فرمائی ہے۔

اہل علم کے لئے خود تجارت کرنا مناسب نہیں

حضرتؒ نے اپنے ایک شاگرد کا نام لے کر بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ کتنی محنت سے اور کتنی آرزوؤں سے اُن کو پڑھایا تھا، بڑی توقعات تھیں کہ وہ کچھ کام کریں گے، اُن کی صلاحیت بھی اچھی تھی، میرے مشورے سے اُنہوں نے افتاء بھی کیا اور علاقہ میں اُن کا اثر بھی تھا، کچھ کام ہوا بھی، ایک کمرہ اور چھوٹا سا مدرسہ بن گیا، کام شروع ہوگیا، نہ معلوم کیا سوچ کر چھوڑ کر چلے گئے اور دوسری جگہ جا کر کپڑا بیچ رہے ہیں، بتاؤ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک باصلاحیت مفتی اور عالم، اور علم دین کی خدمت چھوڑ کر کپڑا بیچے، اہل علم کی شان یہ نہیں ہے، اُن کو تو دین کی اِشاعت ہی میں لگنا چاہئے، مقدر کی روزی مل کر رہتی ہے، صرف کپڑا ہی نہ بیچے، کپڑا بھی بیچے تو ٹھیک ہے، یعنی دین کا کام بھی کرے اور کپڑا بھی بیچے۔ ''بھی'' کو ''ہی'' سے نہ بدلے کہ صرف کپڑا ہی بیچے، اگر کوئی کرنے والا ہو تو دونوں کام کرسکتا ہے؛ لیکن ہے بہت مشکل، دونوں کام ساتھ ہو نہیں پاتے، اسی وجہ سے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس سے منع فرمایا، اور آج کل تو بالکل مناسب نہیں، یعنی علم دین کی خدمت کے ساتھ کپڑا بھی نہ بیچے؛ کیوں کہ دونوں کام ہو نہیں پاتے، بہت مشکل ہوتا ہے، پھر آدمی ایک ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے، آئے دن اسباق کا ناغہ کرے گا، مطالعہ میں کوتاہی کرے گا، یا پھر آدمی اتنا پختہ ہو اور علم دین کی خدمت کی اُس کو ایسی دھن لگی ہو اور علم کا ایسا چسکا لگا ہو کہ طلبہ کا نقصان نہ ہونے دے، اور علم کا پورا حق ادا کرے؛ لیکن ایسا ہونا بہت مشکل ہے، ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے، اس لئے ہمارے بڑے اس سے منع کرتے ہیں، اور بغیر تنخواہ لئے پڑھانے سے بھی منع کرتے ہیں؛ کیوں کہ شیطان کو بہکانے کا موقع ملے گا، آئے دن ناغہ کرے گا، بغیر مطالعہ کے پڑھائے گا،

شیطان سمجھائے گا کہ کیا حرج ہے؟ کون تنخواہ لیتے ہو؟ فی سبیل اللہ پڑھاتے ہو۔ اِس سے بہتر ہے کہ تنخواہ لے کر پڑھائے؛ لیکن ناغہ نہ کرے، علم کو ضائع نہ کرے، طلبہ کا نقصان نہ کرے، تنخواہ لے کر پڑھانا کوئی ناجائز نہیں ہے، بہت زیادہ تقویٰ کا غلبہ ہے تو تنخواہ لے کر پھر مدرسہ میں دے کر رسید کٹوادے، جیسا کہ حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ کرتے تھے کہ تنخواہ تو لیتے تھے، لے کر پھر مدرسہ میں جمع کردیتے تھے۔

الغرض تجارت اور علمی خدمت یعنی تدریس دونوں جمع نہیں ہوسکتے، بہت مشکل ہے، یا پھر مضاربت کرے، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے مضاربت پر معاملہ کررکھا تھا۔

حضرتؒ کے ایک استاذ کا حال

میرے ایک اُستاذ تھے، پانی پت میں وہ لکڑی کا کاروبار بھی کرتے تھے اور پڑھاتے بھی تھے، اُن کی لکڑی کی ٹال تھی؛ لیکن حالت یہ تھی کہ فجر سے پہلے ہی اَسباق پڑھانا شروع کردیتے تھے، کچھ اسباق فجر بعد پڑھایا کرتے تھے، ۸-۹ر بجے تک سارے اسباق سے فارغ ہوجاتے، اس کے بعد ٹال چلے جاتے، کبھی سبق کا ناغہ نہ کرتے، بہت پابندی سے اور محنت سے پڑھاتے، میں نے بھی اُن سے کئی کتابیں پڑھی ہیں؛ لیکن ہر ایک تو ایسا نہیں کرسکتا (خصوصاً آج کل مدارس میں کتابوں اور گھنٹوں کی جو تقسیم ہوتی ہے اس میں دوسرے اوقات میں اسباق پڑھانا بھی ناممکن ہے)

احقر راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بے شک یہ کام بہت مشکل ہے کہ آدمی دونوں کام کرلے اور دونوں کے حقوق بھی پورے پورے ادا کرے، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو یہ شرف بخشا تھا کہ انہوں نے بغیر تنخواہ لئے پڑھایا، گھر کے خرچ کے لئے وقتاً فوقتاً تجارت بھی کرتے، اس طرح کہ تعلیم کا نقصان نہ ہو، بعد میں اُن کے صاحب زادوں نے کام سنبھال لیا، نیز اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضرت بھی فجر سے پہلے عربی کے اسباق پڑھایا کرتے تھے، تھوڑے طلبہ تھے، سارے اسباق فجر سے پہلے اور کچھ فجر کے بعد پڑھاتے، اس کے بعد درجہ حفظ کے طلبہ کو پڑھاتے، ان کا سبق وغیرہ سنتے، ابتدائی دور میں حضرت خود ہی عربی کے اسباق بھی پڑھاتے، اور حفظ بھی پڑھاتے۔ احقر راقم الحروف نے بھی ہدایہ ثالث حضرت اقدسؒ سے فجر سے پہلے پڑھی ہے، احقر حضرت کو گھر سے لینے جاتا، حضرت فجر سے پہلے مدرسہ تشریف لے آتے، سارے طلبہ کو جگادیا جاتا، فجر سے پہلے ہی ہدایہ کا سبق ہوتا، بعد میں ہدایہ دوسرے استاذ کے پاس منتقل ہوگئی، فجر سے پہلے حضرت ڈاک وغیرہ لکھتے، کبھی مطالعہ فرماتے۔ ❍❖❍

مادیت کا فتنہ اور اُس کا علاج

محدثُ العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ

آج کل دنیا طرح طرح کے فتنوں کی آماج گاہ بنی ہوئی ہے، ان سب فتنوں میں ایک بنیادی اور بڑا فتنہ ''پیٹ'' کا ہے، شکم پروری وتن آسانی زندگی کا اہم ترین مقصد بن کر رہ گیا ہے، ہر شخص کا شوق یہ ہے کہ لقمہ تر اس کی لذت کام ودہن کا ذریعہ بنے اور یہ فتنہ اتنا عالم گیر ہے کہ بہت کم افراد اس سے بچ سکے ہیں، تاجر ہو یا ملازم، اسکول کا ٹیچر ہو یا کالج کا پروفیسر، دینی درس گاہ کا مدرّس ہو یا مسجد کا امام، اس آفت میں سب ہی مبتلا نظر آتے ہیں، ہاں! فرقِ مراتب ضرور ہے، زہد وقناعت، ورع وتقویٰ اور اِخلاص واِیثار جیسے اخلاق وفضائل اور ملکات کا نام ونشان نہیں ملتا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پورا عالم ساز وسامان کی فراوانی کے باوجود حرص وآز، طمع ولالچ اور زر طلبی وشکم پروری کی بھٹی میں جل رہا ہے اور کرب واضطراب، بے چینی وبے اطمینانی اور حیرت وپریشانی کا دھواں چہار سمت پھیلا ہوا ہے۔

دراصل اس فتنۂ جہاں سوز کا بنیادی سبب یہی ہے، جس کی نشان دہی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، آخرت کا یقین بے حد کمزور اور آخرت کی نعمتوں اور راحتوں کا تصور تقریباً ختم ہو چکا ہے، مادی نعمتیں اور ان کا تصور اس قدر غالب ہے کہ روحانی قدریں مضمحل ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسانوں کی چھوٹائی، بڑائی، عزت وذلت اور بلندی وپستی کی پیائش ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ کے پیمانے سے نہیں ہوتی، بلکہ ''پیٹ اور جیب'' کے پیمانے سے ہوتی ہے، مادیت کے اس سیلاب میں پہلے ایمان ویقین رُخصت ہوا، پھر انسانی اخلاق ملیامیٹ ہوئے، پھر اسوۂ نبوت سے وابستگی کمزور ہو کر ''اعمالِ صالحہ'' کی فضا ختم ہوئی، پھر معاشرت ومعاملات کی گاڑی لائن سے اتری، پھر سیاست وتمدن تباہ ہوا اور اب مادیت کا یہ طوفان انسانیت کو بہیمیت کے گڑھے میں ڈھکیل رہا ہے، انفرادی بے اصولی اور آوارگی وبے راہ روی اور بے رحمی وشقاوت کا وہ دور دورہ ہے کہ الامان والحفیظ۔

الغرض اس ''پیٹ'' کے فتنے نے ساری دنیا کی کایا پلٹ ڈالی ہے، دنیا بھر کے عقلا ''پیٹ'' کی فتنہ سامانی کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں وہ اس فتنہ کے ہول ناک نتائج کا تدارک بھی کرنا چاہتے ہیں، مگر صد حیف کہ علاج کے لیے ٹھیک وہی چیز تجویز کی جاتی ہے جو خود سبب مرض ہے، درحقیقت انبیا علیہم السلام ہی انسانیت کے نباض ہیں اور انہیں کا تجویز کردہ علاج اس مریض کے لیے کارگر ہوتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہول ناک مرض کی صحیح تشخیص بہت پہلے فرمادی تھی، چناں چہ ارشاد فرمایا:

فَوَاللّٰهِ مَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ''. (صحيح البخاری ۹۵۱/۲، ط: قديمی، صحيح المسلم، كتاب الزهد ٤٠٧/٢ ط: قديمی)

بخدا! مجھے تم پر فقر کا اندیشہ قطعاً نہیں، بلکہ اندیشہ ہے کہ تم پر دنیا پھیلائی جائے، جیسا کہ تم سے پہلوں پر پھیلائی گئی، پھر تم پہلوں کی طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو، پھر اس نے جیسے ان کو برباد کیا، تمہیں بھی برباد کر ڈالے۔

لیجئے! یہ تھا وہ نقطۂ آغاز، جس سے اِنسانیت کا بگاڑ شروع ہوا، یعنی دنیا کو نفیس اور قیمتی چیز سمجھنا اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس پر جھپٹنا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشخیص پر ہی اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ اس کے لیے ایک جامع نسخہ شفا بھی تجویز فرمایا، جس کا ایک جز اعتقادی ہے اور دوسرا عملی۔

اعتقادی جز یہ ہے کہ اس حقیقت کو ہر موقع پر مستحضر رکھا جائے کہ اس دنیا میں ہم چند لمحوں کے مہمان ہیں، یہاں کی ہر راحت و آسائش بھی فانی ہے اور ہر تکلیف و مشقت بھی ختم ہونے والی ہے، یہاں کے لذائذ و شہوات، آخرت کی بیش بہا نعمتوں اور ابدالآباد کی لازوال راحتوں کے مقابلہ میں کالعدم اور ہیچ ہیں۔ قرآنِ کریم اس اعتقاد کے لیے سراپا دعوت ہے اور سینکڑوں جگہ اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں نہایت بلیغ مختصر اور جامع الفاظ میں اس پر متنبہ فرمایا:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى. (الأعلیٰ: ١٦-١٧)

(کان کھول کر سن لو! کہ تم آخرت کو اہمیت نہیں دیتے) بلکہ دنیا کی زندگی کو (اس پر) ترجیح دیتے ہو، حالاں کہ

آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور لازوال ہے۔

اور عملی حصہ اس نسخہ کا یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی تیاری میں مشغول ہوا جائے اور بطورِ پرہیز کے حرام اور مشتبہ چیزوں کو زہر سمجھ کر ان سے کلی پرہیز کیا جائے اور یہاں کے لذائذ وشہوات میں انہماک سے کنارہ کشی اختیار کی جائے، دنیا کا مال واسباب، زن وفرزند، خویش واقربا اور قبیلہ و برادری کے سارے قصے زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھ کر صرف بقدرِ ضرورت ہی اختیار کیے جائیں، ان میں سے کسی چیز کو بھی دنیا میں عیش وعشرت اور لذت وتنعم کی زندگی گزارنے کے لیے اختیار نہ کیا جائے اور نہ یہاں کی عیش کوشی کو زندگی کا مقصد اور موضوع بنایا جائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

اِیَّاکَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰہِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ. (مشکاۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء ۴۴۹/۲ ط: قدیمی)

عیش وعشرت سے پرہیز کرو؛ کیوں کہ اللہ کے بندے عیش پرست نہیں ہوتے۔

تعجب ہے کہ اگر کسی ڈاکٹر کی رائے ہو کہ دودھ، گھی، گوشت، چاول وغیرہ کا استعمال مضر ہے تو اس کے مشورے اور اشارے سے تمام نعمتیں ترک کی جاسکتی ہیں، لیکن خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات اور وحی آسمانی کے صاف احکام پر ادنیٰ سے ادنیٰ لذت کا ترک کرنا گوارا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل واصحاب کرام کی زندگی اور معیارِ زندگی کو اوّل سے آخر تک دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دنیا کی نعمتوں سے دل بستگی سراسر جنون ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قصہ مروی ہے کہ کچھ لوگوں پر ان کا گزر ہوا، جن کے سامنے بھنا ہوا گوشت رکھا تھا، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کھانے کی دعوت دی، آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہ کھائی۔'' (صحیح بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ یاکلون، ج:۲،ص:۸۱۵، ط: قدیمی)

مہینوں پر مہینے گزر جاتے، مگر کاشانۂ نبوت میں نہ رات کو چراغ جلتا، نہ دن کو چولہا گرم ہوتا، پانی اور کھجور پر گزر بسر ہوتی، وہ بھی کبھی میسر آتیں، کبھی نہیں، تین تین دن کا فاقہ ہوتا، کمر سیدھی رکھنے کے لیے

پیٹ پر پتھر باندھے جاتے اور اسی حالت میں جہاد وقتال کے معرکے ہوتے۔

الغرض زہد وقناعت، فقر وفاقہ، بلند ہمتی و جفاکشی اور دنیا کی آرائشوں سے بے رغبتی اور نفرت و بے زاری سیرتِ طیبہ کا طرۂ امتیاز تھی، اپنی حالت کا اس ''پاک زندگی'' سے مقابلہ کرنے کے بعد ہم میں سے ہر شخص کو شرم آنی چاہیے۔ ہمارے یہاں سارا مسئلہ روٹی اور پیٹ کا ہے اور وہاں یہ سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ زندگی بالقصد اختیار کی گئی تھی، تاکہ آئندہ نسلوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو آپ کو من جانب اللہ کیا کچھ نہ دیا جا سکتا تھا؟ مگر دنیا کا یہ ساز وسامان، جس کے لیے ہم مرکھپ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس قدر حقیر وذلیل ہے کہ وہ اپنے محبوب ومقرب بندوں کو اس سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے، بعض انبیا علیہم السلام کو عظیم الشان سلطنت بھی دی گئی، مگر ان کے زہد وقناعت اور دنیا سے بے رغبتی اور بے زاری میں فرق نہیں آیا، ان کے پاس جو کچھ تھا، دوسروں کے لیے تھا، اپنے نفس کے لیے کچھ نہ تھا۔

الغرض یہ ہے ''فتنہ پیٹ'' کا صحیح علاج، جو انبیا علیہم السلام اور بالخصوص سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا اور اگر انسان ''پیٹ کی شہوت'' کے فتنہ سے بچ نکلے تو ان شاء اللہ ''شہوتِ فرج'' کے فتنہ سے بھی محفوظ رہے گا کہ یہ خرمستی پیٹ بھرے آدمی کو ہی سوجھتی ہے، بھوکا آدمی اس کی آرزو کب کرے گا؟ ان ہی دو شہوتوں سے بچنے کا نام اِسلام کی اِصطلاح میں ''تقویٰ'' ہے، جس پر بڑی بڑی بشارتیں دی گئی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ضعیف مریض کو بقائے حیات کے لیے ہلکی پھلکی، معمولی غذا کا مشورہ دیا جاتا ہے اور زبان کے چسکے سے بچنے کی سخت تاکید کی جاتی ہے، تاکہ مطلوبہ اعلیٰ ''صحت'' نصیب ہو، بس یہی حیثیت اِسلام کی نظر میں دنیا کی ہے۔ (بصائر وعبر ۱/۱۱۰-۱۱۳)

❍❖❍

ماہنامہ ندائے شاہی مرادآباد
ایک عظیم اصلاحی تحریک کا نام ہے
صرف ایک ممبر بنا کر آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے۔

اِیمان کے چند اَہم شعبے

حضرت مولانا اسرارالحق صاحب قاسمی (ایم پی) وصدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن ذاکر نگر، نئی دہلی

ایمان ایک کلی وحدت ہے اور اس کی بہت ساری شاخیں اور شعبے ہیں، ان شعبوں پر عمل کرنا اور انھیں اپنی زندگی میں اتارنا مسلمانوں کا نصب العین ہونا چاہیے، اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی شب و روز کی پوری زندگی میں مکمل طور پر اسلام کو اپنانے والے بن جائیں۔ اسلام چند ایک ظاہری اعمال پر زور دینے کے بجائے حسبِ استطاعت اس کے تمام تقاضوں پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے کو مشرق یا مغرب کی طرف کرو؛ لیکن نیکی یہ ہے کہ جو لوگ اللہ پر، آخرت کے دن، فرشتوں، کتاب، گزشتہ تمام نبیوں پر ایمان لائیں اور اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں پر خرچ کریں، نمازوں کا اہتمام کریں، زکوٰۃ دیں، اپنے وعدوں کو پورا کریں، مصیبت اور پریشانی کے عالم میں صبر کریں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں''۔ (البقرہ:۱۷۷)

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان کے کئی خصائل کا ذکر کیا ہے، ایک تو یہ کہ بندہ اللہ کی وحدانیت، آخرت، فرشتوں، کتاب، گزشتہ نبیوں پر ایمان لائے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، فقیروں، غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے اور ان پر حسبِ استطاعت خرچ بھی کرے، اسی طرح ایمان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان کی پابندی سے بجاآوری کی جائے، دوسروں سے معاملات کرنے میں دیانت داری اور ایمان داری برتی جائے، اسی طرح اگر انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کوئی مصیبت یا پریشانی آجائے، کوئی بیماری لاحق ہوجائے تو صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا جائے۔ جن لوگوں کے اندر یہ سب خصلتیں پائی جائیں گی یا پائی جاتی ہیں، وہ اللہ کے نزدیک

اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں اور متقی و پرہیزگار بھی ہیں۔

احادیثِ مبارکہ میں بھی جگہ جگہ ایمان اور اس کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا گیا اور ان پر عمل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایمان کے ساٹھ سے بھی زیادہ شعبے ہیں اور حیا ایمان کا ایک اہم شعبہ ہے''۔ (صحیح بخاری، حدیث:۹)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ایک دن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عام لوگوں کے بیچ موجود تھے کہ اسی دوران جبریلِ امین نازل ہوگئے اور انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ''ایمان کیا ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو، اُس کے فرشتوں کو، موت کو، اُس کے رسولوں کو اور بعث بعد الموت کو مانو''۔ (صحیح بخاری حدیث:۵۰)

اُن ہی سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''ایمان کے ستر (یا ساٹھ) سے زائد شعبے ہیں، افضل ترین شعبہ ''لا الہ الا اللہ'' کہنا ہے اور اس کا کمتر درجہ راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے اور حیا ایمان کا ایک اہم شعبہ ہے''۔ (صحیح مسلم حدیث:۳۵)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایمان کی چالیس خصلتیں ہیں، سب سے اعلیٰ کسی کو ایک بکری بطور ہدیہ کے دے دینا ہے (کہ وہ اس سے اپنی ضروریات پوری کرنے میں مدد لے) کوئی بھی مسلمان اگر ان خصلتوں میں سے کوئی خصلت ثواب کی امید اور بدلے کی توقع میں اختیار کرتا ہے، تو اس کے عوض اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا''۔ (صحیح بخاری حدیث:۶۲۳۱)

مذکورہ بالا حدیثوں میں جو شعبِ ایمان یا ایمان کی خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب مؤمنانہ اعمال اور ایمان کے اجزا ہیں، ان میں سے کچھ کا تعلق جسمانی اعمال سے ہے، کچھ کا اعمالِ قلب سے اور کچھ کا زبان کے اعمال سے۔ اعمالِ قلب میں اعتقادات اور نیتیں داخل ہیں، ان میں سب سے پہلے تو ایمان باللہ شامل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی ذات، اس کی جملہ صفات، اس کی وحدانیت اور اس کی بے نظیری کا اعتقاد رکھے، دوسرے نمبر پر فرشتوں پر، پھر خدائی کتابوں پر، پھر اس کے

جملہ پیغامبروں پر، اچھی بری تقدیر پر، آخرت کے دن پر، قبر میں فرشتوں کے سوال پر، بعث بعد الموت اور میدانِ حشر میں جمع ہونے پر، حساب کتاب پر، میزانِ عمل، پل صراط، جنت وجہنم، سب پر ایمان لائے۔ اسی طرح ایمان کے خصائل بہت سارے ہیں، جن میں اللہ سے محبت، اللہ کے لیے اس کے بندوں سے محبت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، ان کی تعظیم وتکریم، ان پر درود بھیجنا، ان کی سنتوں کی پیروی، قول وعمل میں اخلاص، گناہوں سے توبہ، خوف ورجا، شکر ووفا، صبر ورضا، توکل، رحمت، تواضع، بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت، کبر وعجب سے احتراز، حسد سے اجتناب، کینہ کپٹ سے دوری اور بلاوجہ غصہ سے پرہیز جیسی عادتیں شامل ہیں۔

جہاں تک اعمالِ لسان کی بات ہے، تو اس کا مطلب ہے زبان سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنا، قرآن کریم کی تلاوت، علم سیکھنا سکھانا، دعا کرنا، خدا کا ذکر، گناہوں سے استغفار اور لغو گوئی سے اجتناب کرنا ہے۔ اور ایمان پر دلالت کرنے والے بدنی وجسمانی اعمال بہت سارے ہیں، مثلاً: یہ کہ انسان کا جسم چھوٹی بڑی نجاستوں سے پاک ہو، ناپاکیوں سے بچے، سترِ عورت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، عمرہ، طوافِ بیت اللہ، اعتکاف، شبِ قدر کی تلاش، سخاوت، بھوکوں کو کھلانا، مہمانوں کا اکرام کرنا، منتیں پوری کرنا، کفارات ادا کرنا، (استطاعت ہونے پر) نکاح کرکے اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کرنا، اہل وعیال کے حقوق ادا کرنا، والدین کی اطاعت وفرماں برداری کرنا، بچوں کی اچھی تربیت، صلہ رحمی، امیر کی اطاعت، لوگوں کے درمیان صلح کرانا، امانت پوری کرنا، پڑوسی کا اکرام کرنا، لوگوں سے حسنِ معاملگی کے ساتھ پیش آنا، حلال مال کمانا اور اسے جائز مصارف میں خرچ کرنا، فضول خرچی اور اسراف سے بچنا، سلام کا جواب دینا، چھینکنے والوں کی چھینک کا جواب دینا، لوگوں کی پریشانیوں کو دور کرنا، لہو ولعب سے بچنا، راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا۔

مذکورۂ بالا آیت اور احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام محض زبان سے توحید ورسالت کے اقرار کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک انسان کے کامل مومن ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی شب وروز کی زندگی ان اعمال وافعال کی انجام دہی میں بسر ہو، جن کے کرنے کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے اور ان اُمور سے اجتناب اور پرہیز کیا جائے، جن سے اسلام نے اپنے ماننے

والوں کو روکا ہے۔ آج یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے ہزار دعوے کرتے ہیں مگر عملی زندگی میں ہماری حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ ہے۔ صرف زبان سے مسلمان ہونے کا نعرہ اور دعویٰ ہے اور عمل سے کورے ہوتے جارہے ہیں۔ اللہ نے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو اسلام دیا تھا، وہ نہایت ہی مکمل تھا اور اس کے اندر مسلمانوں کی دین اور دنیا دونوں کی کامیابی و کامرانی کی بھرپور ضمانت تھی، مگر جوں جوں زنانہ خیرالقرون سے دور ہوتا گیا، مسلمانوں کی حالت بگڑتی گئی اور ان کے اعمال و کردار میں گراوٹ آتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہم محض قول اور دعوی تک محدود ہو کر رہ گئے اور عمل سے کوسوں دور ہو گئے۔ آج مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے عقائد درست کرنے کے ساتھ اپنے اعمال و کردار کو بہتر کرنے کی بھی فکر کریں، جب تک ہمارے اعمال درست نہیں ہوں گے اس وقت تک نہ تو ہماری پریشانیوں کا دور ختم ہوگا اور نہ ہمیں ہمارا روشن ماضی مل سکے گا۔ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ اپنے اعمال پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اعمال کے بغیر ہمارے دعوے محض دعوے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری ناکامیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہیں اور ساری دنیا میں مسلمان ہی دشمنوں کا ہدف بنے ہوئے ہیں، ہمیں اپنے حکمرانوں سے شکایت ہے، نظامِ حکومت سے شکایت ہے اور دشمنانِ اسلام سے شکایت ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ متعصّبانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں، یہ سب باتیں کسی نہ کسی درجے میں درست ہیں، مگر ان سب کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم اپنی تباہی و بربادی میں خود بھی شریک ہیں، ہم پر جب مصیبتیں نازل ہوتی ہیں تو اسلام، ایمان اور خدا اور رسول کی دہائیاں دیتے ہیں، مگر جب باری آتی ہے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے، اس کی اطاعت وفرماں برداری کرنے اور اس کے احکام کو بجالانے کی، تو ہم سرکشی و نافرمانی پر اڑ جاتے ہیں اور خدائے پاک کی جانب سے مقرر کردہ حدود کی بے جھجک دھجیاں اڑانے لگتے ہیں۔ ایسے میں ہمارے دن کیسے پھر سکتے ہیں؟ ہمیں ضرورت ہے کہ اپنے ایمان کو مضبوط کریں اور اپنے دعویٰ صحیح ثابت کرنے کے لیے اعمال و کردار کی پختگی سے خود کو لیس کریں۔

○❖○

عصرِ حاضر میں دینی مدارس؛

اَہمیت وضرورت

مولانا مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی وادیٔ مصطفیٰ شاہین نگر، حیدرآباد

اصلاح حال کے حوالے سے سرگرم مختلف تحریکوں اور تنظیموں اور اس کے نمائندہ لوگوں کی جانب سے یہ رویہ مشاہد میں آرہا ہے کہ وہ دبی زبان اور غیر محسوس لب ولہجہ میں مدارس کی افادیت اور ان کی نافعیت کا یا تو بالکل انکار کررہے ہیں یا اپنی ناقص فہم میں ان کی نافعیت کو بالکل محدود ٹھہرانے پر تلے ہیں۔ ان میں بعض ان تحریکوں سے وابستہ حضرات وہ ہیں جو تہذیب جدید، اس کی چکاچوند اور اس کے رائج کردہ خدانا آشنا، مذہب بیزار اور مادہ پرست نظام تعلیم کے زیر اثر اس طرح کی بیمار اور مذموم ذہنیت کا مظاہرہ کررہے ہیں، یہ لوگ قرآن فہمی اور حدیث دانی کے لئے اپنے محدود فہم میں عربی کی تھوڑی سی شُد بُد یا اس کے صرف ترجمہ پڑھ لینے ہی کو کافی سمجھ رہے ہیں، یہ لوگ مدارس کے تعلق سے ایسے طنز آمیز اور رکیک جملہ بازیوں اور اس قسم کی دریدہ دہنی سے بھی گریز نہیں کرتے کہ ''یہ مدارس معاشرے پر خیراتی بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہیں'' گویا یہ اپنے اس طرز عمل کے پس پردہ مدارس کے سارے نصاب ونظام ہائے شب وروز کی تگ ودو اور وہاں کی ساری نقل وحرکت کو فرسودہ، نامعقول، غیر نفع بخش اور تضیعِ اوقات باور کرانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس کے بالمقابل بعض حضرات وہ ہیں جو محض اصلاح کی کسی بھی تحریک سے وابستگی اور اس کے طریقۂ کار اور نظام عمل پر مکمل کاربند رہنے ہی کو گویا مدارس کے دس بارہ سالہ تعلیمی وتربیتی دورانیہ کے ہم پلہ اور مماثل قرار دے رہے ہیں۔ ان مختلف الانواع اور ہمہ پہلو اصلاحی، دعوتی اور رفاہی تحریکوں کی جدوجہد، اصلاحِ معاشرہ اور منکرات کے ازالہ اور خاتمہ کے لئے ان کی جانب سے کی جانے والی جانفشانی اور ان کے سماج پر انداز ہونے والے طریقۂ کار کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

لیکن مدارس کو ان نوع بنوع اور ہمہ اقسام تحریکوں وتنظیموں کے بیچ وہی حیثیت حاصل ہے جو

سارے نظام شمسی میں کواکب وسیّارات کے مقابل سورج کو ہے کہ ان تمام کی ساری رونق، چمک دمک اور قوت ورعنائی کا اصل منبع اور سرچشمہ یہی سورج ہے، آپ اصلاحی یا رفاہی کسی بھی تحریک کی جدوجہد کے بنیادی ڈھانچہ اور اس کے ابتدائی مراحل کا جائزہ لیجئے، اس کا آخری سرا کہیں نہ کہیں انہیں مدارس سے مربوط نظر آئے گا، اس کی زمام اور باگ انہیں مدارس کے فارغ التحصیل علماء کے ہاتھوں میں ہوگی، یا اس تحریک کے مختلف ادوار میں اس کی ترقی وترویج اور تقویت کے یہی باعث نظر آئیں گے، آج بھی قرآن وحدیث پر گہری بصیرت، علوم اسلامیہ پر کامل دسترس اور ان علوم کے تئیں وسیع نظر اور دوربیں نگاہ چاہتے ہیں، تو وہ اُنہیں مدارس اور اسی نصاب تعلیم وتربیت کے زیرِ اثر حاصل ہوگی۔

مدارس کے نصاب تعلیم پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ

بعض لوگوں کا یہ مطالبہ کہ مدارس کے موجودہ نصاب تعلیم کے ڈھانچہ کو یکسر بدل دیا جائے اور اس کی جگہ ایک ایسا نیا نصاب رائج کیا جائے کہ جوان مدارس کے فارغین کے معاشی کفالت اور عصری تقاضوں کی تکمیل کا بھی ضامن ہو، اس طرح کا یہ مطالبہ نہ تو عقل ودانش کے موافق ہے اور نہ ہی یہ بات مدارس اسلامیہ کے قیام کے اہداف ومقاصد کے ہم آہنگ نظر آتی ہے، یہی جزوی ترامیم اور تبدیلیاں تو یہ علماء دین اور اربابِ مدارس وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ آج سے ساٹھ سال قبل داخل درس نظام کا نقشہ موجودہ نصاب سے ملا کر دیکھئے، موجودہ نقشہ اس سے یکسر مختلف نظر آئے گا، ابھی فی الحال موجودہ احوال اور تقاضوں کے پیش نظر عالمیت سے فراغت کے بعد دوسالہ انگریزی دانی کا کورس بھی مدارس میں شروع کر دیا گیا ہے، اس کا ذوق رکھنے والے فارغ التحصیل طلباء اس شعبہ سے منسلک ہوکر انگریزی پر عبور حاصل کررہے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ سے جب ایک دفعہ کسی نے نصاب میں تبدیلی کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے یوں فرمایا تھا:

''جہاں تک نصاب کا تعلق ہے تو وہ بالکل قابل اطمینان ہے یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے ہیں! البتہ جزوی ترمیم وتغیر تو پہلے بھی ہوتی رہی ہے، اور آئندہ بھی ہوگی، البتہ اصل وہی ہیں جو نہیں بدل سکتے، جیسے صحاح ستہ اور قرآن کریم کی تعلیم، باقی جتنے علوم آلیہ ہیں، مبادی ہیں، ان میں جزوی طور پر تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے، نوعی طور پر نصاب وہی باقی رہا، اس لئے جہاں تک نصاب کا

تعلق ہے وہ تو بالکل قابلِ اطمینان ہے''۔(دینی مدارس،ابن الحسن عباسی:۱۱۰)

ہم اِن کوتاہ اندیش اور ناداں حضرات سے جو مدارس کے نصاب ونظام کی مکمل تبدیلی اور اس کے عصرِ حاضر کے تقاضوں کے ہم آہنگ اور ہم رنگ کرنے کے طالب ہیں، یا ان مدارس میں وہاں کے فارغین کے معاشی طور پر خودکفیل ہونے کے لئے مختلف صنعت وحرفت کے شعبہ جات کے وہاں پر قیام کی تجاویز دیتے ہیں (گرچہ اوقاتِ تعلیم سے ہٹ کر یا عالمیت کی تکمیل کے بعد مستقلاً طلباء کو خود اختیاری طور پر اِس قسم کی ٹریننگ دی جاتی ہے) ہم ان سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ان میں سے کبھی کسی نے بڑے بڑے اسکول اور کالجس کے چلانے والوں یا بڑی بڑی میلوں، کمپنیوں اور کارخانوں کے ٹھیکیداروں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ لوگ وہاں طلباء اور کارکنان کو اس عصری تعلیم سے ہٹ کر یا کارخانے کی عصری مصروفیت سے تھوڑا سا ٹائم علٰحدہ کرکے، ان کے اسلامی شعور کو بیدار اور زندہ رکھنے کے لئے، دینی تعلیم کا بھی کوئی نظم ونسق کریں؛ تاکہ ان کی اس دنیا کے ساتھ ان کی آخرت کے سدھار کا بھی سامان ہوجائے۔

مدارس کا موجودہ نصابِ تعلیم حذف واضافہ تغیر وتبدل کے مختلف ادوار ومراحل سے گذر کر موجودہ حالت میں آیا ہے، یہ مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ علمی وتعلیمی تاریخ کا نچوڑ ہے، اس نصابِ تعلیم میں مختلف وقتوں میں تغیرات ہوتے رہے ہیں اور مختلف اثرات واحوال کے ماتحت اس میں ترمیم وتنسیخ کا عمل جاری وساری رہا ہے، آخر میں جس سلسلۂ درس اور نصابِ تعلیم کی قسمت میں جہانگیری اور دوام وبقا لکھا تھا، جس کا سکہ ہندوستان سے لے کر افغانستان وایران تک رہا، اس کے نامور بانی ''ملا نظام الدین سہالوی'' (م ۱۱۶۱) رہے ہیں، جن کا نصاب تعلیم خفیف حذف ترمیم کے ساتھ آج تک بھی مدارس میں رائج ہے۔(ہندوستانی مسلمان ۱۲۸)

اُمتِ اسلامیہ پر مدارس کا احسانِ عظیم

جس طرح ایک انسان اپنی زندگی کے بقا اور دوام کے لئے خوراک اور پوشاک کو ضروری خیال کرتا ہے، بعینہٖ بلکہ اس سے بڑھ کر ایک حقیقی مسلمان اپنی اسلامی شناخت، تہذیبی خصوصیات اور معاشرتی امتیازات سے وابستگی اور اپنے ملی وجود کی حفاظت کو اس سے کہیں بڑھ کر اہمیت دیتا ہے، وہ کسی دام پر اپنے ملی تشخص اور اپنے امتیازات وشعائر سے دستبردار نہیں ہوسکتا، چونکہ خوراک سے پیٹ اور پوشاک سے جسم

کی حفاظت تو ہوسکتی ہے، لیکن ایک حقیقی مسلمان کے پاس اس کے پیٹ اور جسم کے ان تقاضوں اور ان مادی ضرورتوں کے علاوہ بھی ایک اہم چیز اور بھی ہے، وہ ہے اس کا دین اور ایمان اور اس دین سے پیدا ہونے والی خصوصیات۔

مسلمان بھوکا تو رہ سکتا ہے، لیکن وہ اپنی تہذیبی خصوصیات سے دستبردار نہیں ہوسکتا، اگر وہ اس دین میں رہے گا تو اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ، آج پوری دنیا میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک ملت کے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، آج ہمارا دشمن جسم اور جان کو تک بخش سکتا ہے، لیکن وہ ہماری ملی وجود اور تہذیبی خصوصیات کو چن چن کر ختم کرنے پر تلا ہوا ہے، اگر آج اسلام اپنی تمام خصوصیات وامتیازات کے ساتھ نظر آرہا ہے، تو وہ انہیں مدارس عربیہ کے رہین منت ہے، شہر شہر، گلی گلی، قریہ قریہ، چھوٹی بڑی، کچی پکی جو مساجد آباد نظر آرہی ہیں، مختلف تحریکوں کی شکل میں مسلمانوں کی اخلاقی واعتمادی اور معاشی اصلاح کا جو جال ہر جہت وسمت بچھا ہوا ہے، یا کسی بھی جگہ دین کا شعلہ یا اس کی تھوڑی سی رمق اور چنگاری سلگتی ہوئی نظر آرہی ہے وہ انہیں مدارس کا فیضِ اثر ہے، اگر ان مدارس کا وجود نہ ہوتا تو آج ہم موجود ہوتے؛ لیکن بحیثیت مسلم نہیں، بلکہ ان حیوان نما انسان کے ان تمام درندہ صفت خصوصیات کے ساتھ۔

ہندوستان میں عوامی نذرانے اور ہدایا پر چلنے والے موجودہ شکل کے مدارس کی ابتدائی تحریک کا جائزہ لیجئے کہ کن اسباب ومحرکات کے تحت اس نظام کے حامل مدارس کا آغاز ہوا؟ دراصل اس وقت بھی یہی صورتِ حال تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے زمامِ اقتدار چھن چکا تھا، انگریزی قوم یہاں کے ہر سیاہ وسفید کی مالک ہوچکی تھی، اگر انہیں مستقبل میں اپنے اور اپنے اس آمرانہ حکمرانی کے بیچ کوئی چیز سب سے بڑی رکاوٹ اور حائل نظر آرہی تھی تو وہ یہاں کی غیور، باحمیت اور زندہ دل مسلمانوں کی تھی، چونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کی موجودہ خست وذلت سے نکال کر انہیں رفعت وبلندی کے اوج ثریا پر کوئی چیز پہنچاسکتی ہے تو وہ ہے ان کا ایمان وایقان اور ان کی دینی حمیت۔

چنانچہ اُنہوں نے اِس کے لئے حکومت کے ماتحت چلنے والے تمام تعلیمی اداروں کے نصاب ونظام میں حذف واضافہ شروع کردیا، اس نصابِ تعلیم کی تبدیلی اور ترمیم کا براہِ راست اثر مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ پر ہورہا تھا، وہ اپنی تہذیبی خصوصیات سے دستبردار ہوکر بحیثیت قومِ مسلم کے اپنا وجود کھو رہے تھے،

اِس وقت بھی مدارس ومکاتب کی اسی تحریک ہی کے ذریعہ اسلام کا بچاؤ ممکن ہوسکا۔

چنانچہ مدارس کی اہمیت وضرورت اور مسلم معاشرے پر ان کے احسانِ عظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں: ''ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ عربی مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے، کل جب ہندوستان کی دوسری شکل ہوگی اس سے بڑھ کر ہوگی، یہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد اور مرکز ہوں گے، لوگ آج کی طرح کل بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور اربابِ اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہوں گے اور یہی دیوانے آج کی طرح کل بھی ہوشیار رہیں گے۔ اس لئے یہ مدارس جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، ان کا سنبھالنا، اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اگر ان عربی مدرسوں کا کوئی دوسرا فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اور اونچا ہوتا ہے اور اس کی اگلی نسل کچھ اور اونچی ہوتی ہے، اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی''۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ ان مدارس کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''اس وقت مدارسِ علوم دینیہ کا وجود مسلمانوں کے لئے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں، دنیا میں اگر اسلام کے بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں''۔ (حقوق العلم:۵۱)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ یوں فرماتے ہیں کہ: ''یہی کہنی مدارس تھے (علماء اور طلباء کے نسبت مولانا کی خصوصی اصطلاح) جنہوں نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی کم ہے، اعتقادی واخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے''۔ (الفرقان، افادات گیلانی: نمبر ۱۸۸ بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۱/۴۹)

یہ مدارس معاشرہ کو کیا دے رہے ہیں؟

یہ ایسی واضح اور روشن حقیقت ہے کہ جس کا معاشرے کے حقیقی احوال سے ناواقفیت یا ایسا شخص ہی منکر ہوسکتا ہے جس نے جان بوجھ کر ان احوال سے آگہی کے باوجود اس سے آنکھیں موند لینے کی ٹھان لی ہو کہ دین کا بقاء وتحفظ، اسلامی اقدار وروایات کی پاس وحرمت، مسلمانوں کی اپنی شریعت کے ساتھ سچی وابستگی وعقیدت اور پورے معاشرے کے اصلاح ودرستگی کا اگر کوئی کام انجام دے رہے ہیں تو یہی مدارس ہیں۔

جو کسی نہ کسی طریقے سے براہِ راست یا بالواسطہ اصلاح امت اور بھلائی کے فروغ کے سارے کاز کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، اور یہ مسلم معاشرے کی اسلام کے ساتھ حقیقی ربط وضبط کی برقراری کے لئے تمام ضروریات کی تکمیل (جن میں مساجد کے لئے عملی صلاحیت کے حامل خطباء وواعظ، اسلامی تعلیمات کی تدریس کے لئے مدرسین واساتذہ کی فراہمی، امتِ مسلمہ کے مختلف مسائل اور اس کے اسلامی حل کے لئے دارالافتاء کے قیام اور اس کے لئے باصلاحیت صاحب بصیرت اور دوررس نگاہ مفتیان عظام کے نظم اور امت کے اصلاح کے کاز کو تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ، وعظ وارشاد اور خانقاہی نظام کے ذریعے انقلاب بپا کرنے والے شامل ہیں) میں پوری تندہی کے ساتھ بغیر کسی شور وشغب اور پروپیگنڈے کے مصروف عمل ہیں۔

معاشرے کی دینی ضروریات کی تکمیل میں مدارس کی حیثیت اس کسان کی سی ہے جو زمین کے ہموار کرنے، فصل کے اُگانے اور کٹائی سے لے کر اس غلہ اور اناج کے مارکٹ پہونچنے تک اپنی ساری توانائی اور قوت اس کے پیچھے صرف کرتا ہے، جو غلہ تمام انسانوں کی آسودگی اور بھوک مٹانے کا سبب بنتا ہے، دین کے تمام شعبوں کو زندہ، بیدار اور متحرک رکھنے میں مدارس کی یہی مثال ہے۔

اِس مختصر تحریر کی روشنی میں مدارس کی افادیت اور نافعیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس پرفتن اور مخالفانہ ماحول میں بھی مسلمانوں کے دینی شعور کی بیداری اور ان کی اسلامی تعلیمات کے ساتھ وابستگی اور لگاؤ کا کس قدر عظیم بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں، اور یہ اہل مدارس بقدر کفالت معاش پر تکیہ کئے ہوئے دین کی بقاوتحفظ کا کام کیسے انجام دے رہے ہیں، اس حقیقت کو انہیں مدارس سے وابستہ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں۔ اللہ مزید ہمت اور قوت عطا کرے۔

❍❖❍

ضروری اعلان

ندائے شاہی سے متعلق دفتری اوقات میں صرف درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں:

09410865194

دفتری اوقات : صبح 8 تا 12 ـــــ شام : 3 بجے تا 5 بجے

یہ بھی خیانت ہے

مولانا مفتی تنظیم عالم قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

اَمانت داری ایمان کا حصہ ہے، جو شخص اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ کسی کی امانت میں خیانت نہیں کرسکتا۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اگر میں نے کسی کا حق دبالیا یا اس کی ادائیگی میں کمی اور کوتاہی کی تو میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے، وہ یقیناً اس کا حساب لے گا اور اس دن جب کہ ہر شخص ایک ایک نیکی کا محتاج ہوگا حق تلفی کے عوض میری نیکیاں دوسروں کو تقسیم کردی جائیں گی، پھر میری مفلسی پر وہاں کون رحم کرے گا؟ اس طرح کے تصورات سے اہل ایمان کا دل کانپ اٹھتا ہے اور پھر خیانت یا حق تلفی کرنے سے باز آجاتا ہے؛ لیکن جس کے دل میں ایمان ہی نہ ہو یا ماحول اور حالات نے ایمان کی روشنی سلب کرلی ہو تو خیانت کرنے میں ایسے شخص کو کوئی تردد نہیں ہوتا؛ اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت داری کو ایمان کی علامت اور پہچان قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لاَ اِیْمَانَ لِمَنْ لاَ أَمَانَةَ لَهُ، وَلاَ دِیْنَ لِمَنْ لاَ عَهْدَ لَهُ. (السنن الکبریٰ للبیهقي: رقم: ۱۲۶۹۰)

جس میں اَمانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم کے متعدد مقامات پر امانت داری کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد باری ہے:

فَلْیُؤَدِّ الَّذِیْ اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّه. (البقرة: ۲۸۳)

تو جو امین بنایا گیا اُس کو چاہئے کہ اپنی امانت ادا کرے اور چاہئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں امانت داری کو تقویٰ سے جوڑ دیا ہے یعنی جس کو موت کے بعد کی زندگی حساب وکتاب اور عدالت الٰہی پر یقین ہو جس کے دل میں خوف خدا اور اس کی گرفت کا احساس ہو اُسے چاہئے کہ امانت میں خیانت نہ کرے جس کا جو حق ہے پورا پورا ادا کردے اس لئے کہ اس دنیا میں خیانت کرنے والا قیامت کے دن چین وسکون سے نہیں رہ سکتا، وہاں ایک ایک کا حق ادا کرنا ہوگا اور بڑی دشواریوں کا سامنا ہوگا؛ لیکن جس کو آخرت پر یقین نہیں وہ جو چاہے کرے دنیا میں چند روزہ زندگی کے بعد

آخر اپنے کئے ہوئے پر افسوس ہوگا اور بڑے خسارے میں ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ زمانہ قیامت سے جیسے جیسے قریب ہوگا ایمانی قوت کم ہوتی چلی جائے گی اس کے نتیجے میں امانت داری بھی اٹھ جائے گی اور حال یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادی ہوگی مگر امانت دار آدمی پوری آبادی میں ایک آدھ بڑی مشکل سے دستیاب ہوگا اور وہ بھی حقیقت میں امین نہ ہوگا۔ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے؛ حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔ (صحیح بخاری/کتاب الفتن)

امانت داری کی اس قدر اہمیت کے باوجود آج کے معاشرہ میں اسے کوئی وزن نہیں دیا جاتا، اچھے اچھے لوگ بھی جو عرف میں دین دار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی امانت اور حق کی ادائیگی کا پاس ولحاظ نہیں رکھتے، انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ امانت کی حفاظت اور اس کا مکمل طور پر ادا کرنا دینی وشرعی فریضہ ہے، بعض لوگوں میں امانت داری کا جذبہ ہوتا بھی ہے تو وہ صرف مال کی حد تک محدود رہتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کسی کا مال رکھا ہو تو وہ اسے ادا کر دیتا ہے، عام طور پر لوگوں کا ذہن اسی مالی امانت کی طرف جاتا ہے؛ حالانکہ امانت کی اور بھی مختلف قسمیں ہیں، جن کی اہمیت بعض صورتوں میں مالی امانت سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے، ان کی حفاظت بھی ایک مسلمان کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی مالی امانت کی ہوتی ہے؛ اسی لئے فتح مکہ کے موقع پر خانۂ کعبہ کی کنجی جب عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کو دینے اور ان کی امانت ان کو واپس کرنے کی تاکید کی گئی تو امانت کو جمع کے صیغے کے ساتھ استعمال کیا گیا، ارشاد باری ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا. (النساء، آیت: ۵۸)

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچا دیا کرو۔

قابل غور بات یہ ہے کہ کنجی کوئی اہم مال نہیں؛ بلکہ یہ خانۂ کعبہ کی خدمت کی نشانی ہے جس کا تعلق مال سے نہیں عہدے سے ہے، پھر بھی اس کو امانت سے تعبیر کیا گیا اور پھر جمع کا صیغہ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ امانت کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں جن کی ادائیگی تمام مسلمانوں پر لازم ہے، ذیل میں امانت کی چند ایسی صورتیں بیان کی جارہی ہے جن کی طرف عام طور پر لوگوں کا ذہن نہیں جاتا؛ چنانچہ وہ ان امانتوں میں خیانت کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں اور انہیں کسی معصیت کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا حالانکہ شریعت کی نظر میں ان چیزوں میں بھی خیانت قبیح اور موجب گناہ عمل ہے جس سے ایک مسلمان کا بچنا نہایت ضروری ہے مثلاً:

نااہلوں کو عہدے اور مناصب سپرد کردنا

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ جس عہدہ اور منصب کا جو اہل ہو اسی کو وہ عہدہ سپرد کیا جائے؛ اس کے لئے سب سے پہلے غور کرنا چاہئے کہ اس کے ماتحتوں میں کون ایسا شخص ہے، جس میں پیش نظر ملازمت یا عہدے کی مکمل شرطیں پائی جارہی ہیں، ایسا کوئی شخص مل جائے تو وہی اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے لہٰذا کسی پس وپیش کے بغیر وہ عہدہ اور ملازمت اس کو سپرد کری جائے اور اگر مطلوب صلاحیت کے حامل کوئی شخص دستیاب نہ ہو تو موجودہ لوگوں میں جو سب سے زیادہ لائق وفائق ہو اس کو منتخب کیا جائے، غرض یہ کہ حکومت کے ماتحت جتنے بھی عہدے اور مناصب ہوتے ہیں وہ امانت ہیں اور ارباب حکومت اس کے امین ہیں، اگر حکومت نے اپنے ماتحت کسی شخص کو اس کا مجاز بنایا ہے تو وہ بھی امین ہے' ان سب کو چاہئے کہ عہدے اور منصب پوری دیانت داری سے تقسیم کریں' صلاحیت اور شرائط کو اس کے لئے معیار بنایا جائے نہ کہ قرابت اور تعلق کو۔ اگر کسی شخص کو ذاتی تعلق یا سفارش کی بنیاد پر یا رشوت لے کر کوئی عہدہ اور منصب سپرد کیا جاتا ہے تو یہ خیانت ہے اور تمام ذمہ دار اس خیانت کے مرتکب ہوں گے، ایک موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی وتعلق کے پیش نظر دے دیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔ (جمع الفوائد ۳۳۵)

نااہلوں کو عہدے سپرد کرنے سے گناہ تو ہوتا ہی ہے خود دنیوی اعتبار سے بھی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اس سے مستحقین اور باصلاحیت افراد کے بجائے ناکارہ اور نااہل لوگ عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں ان میں کام کی صلاحیت نہیں ہوتی؛ اس لئے پورا شعبہ بگڑ جاتا ہے اور پھر عوام کے لئے یہ اذیت رسانی کا باعث ہوتا ہے، آج کل ملکی حالات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نیچے سے لے کر اوپر تک تمام شعبوں میں کہیں رشوت اور سفارش اور کہیں تعلق اور قرابت کی بنیاد پر عہدے اور ملازمت تقسیم کی جارہی ہیں، یہاں تک کہ عصری تعلیم گاہوں میں اساتذہ کی تقرری میں رشوت کا لین دین عام ہو گیا ہے اس کے نتیجے میں یہ تعلیم گاہیں باصلاحیت افراد سے محروم ہیں' تقریباً تمام شعبوں کا یہی حال ہے اس لئے حکومت کا نظام فساد کا شکار ہو گیا ہے اور آج ہر شخص اپنی جگہ بے چین ومضطرب نظر آرہا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ اِلیٰ غَیْرِ أَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ. (صحیح البخاري رقم: ۵۹)

جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کو سپرد کردی گئی جو ان کے اہل اور قابل نہیں تو قیامت کا انتظار کرو۔

یعنی جب نااہل افراد کو کوئی ذمہ داری یا عہدہ اور منصب سپرد کیا جائے تو فساد یقینی ہے اور اب دنیوی نظام کو فساد سے کوئی بچا نہیں سکتا؛ اس لئے اب قیامت کا انتظار کرو، اس میں خلافت سے لے کر ایک ادنیٰ ملازمت بھی شامل ہے۔

اس خیانت کا تعلق صرف حکومت اور سرکاری عہدوں سے ہی نہیں؛ بلکہ نجی کمپنی، انجمن اور عوامی اداروں سے بھی ہے جو ان اداروں اور کمپنیوں کو مفید اور بافیض بنانا چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ جس کام کے جو لائق اور اہل ہے، اسے وہیں رکھا جائے، کسی بھی وجہ سے اگر کم تر صلاحیت والے افراد کو فوقیت دی جائے تو ادارہ کبھی ترقی نہیں پاسکتا، دینی مدارس میں بھی تقسیم اسباق اور دیگر امور میں اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے ورنہ اس سے تعلیمی نظام متاثر ہوگا اور ذمہ داران خیانت کے مرتکب ہوں گے۔

مزدور اور ملازمین کا کام چوری کرنا

جو شخص کسی کا مزدور یا ملازم ہو اسے چاہئے کہ مالک اور ذمہ دار سامنے ہو یا نہ ہو مکمل دیانت داری کے ساتھ کام کرے، نہ تو وقت میں کمی کرے اور نہ کام میں سستی اور نہ ہی اپنی صلاحیت کو استعمال کرنے سے گریز کرے، ان تینوں میں سے کچھ پایا گیا تو خیانت شمار ہوگی؛ اس لئے کہ ایک ملازم کی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تنخواہ طے ہوتی ہے اگر اس نے کام کرنے میں پوری صلاحیت صرف نہ کی اور کسی بھی وجہ سے دلچسپی لئے بغیر محض ظاہری طور پر کام کردیا تو کام میں وہ معنویت پیدا نہیں ہوگی جو ذمہ دار کو مطلوب تھی؛ اس لئے وہ تنخواہ بھی مشکوک ہوجائے گی اور خیانت کا بھی گناہ ہوگا۔ اسی طرح اگر مزدور و ملازم سے پانچ چھ گھنٹے کام کرنے کا وقت طے ہوجائے اور پھر کام کرنے والا وقت میں چوری کرے، وقت کے بعد آئے یا متعین وقت سے پہلے چلا جائے تو یہ بھی خیانت ہے، ایک مسلمان ملازم جو کائنات کے مالک کو سمیع و بصیر سمجھتا ہے اور اس پر پورا یقین رکھتا ہے اسے احساس ہونا چاہئے کہ اگرچہ میرا مجازی مالک اور ذمہ دار مجھے نہیں دیکھ رہا ہے؛ لیکن رب تو مجھے دیکھ رہا ہے، اس کی گرفت سے جو بچ گیا وہی کامیاب اور فلاح پانے والا ہے؛ اسی طرح کام میں سستی اور ٹال مٹول کرنا بھی خیانت ہے، وہ کام جو پانچ گھنٹے میں ہوسکتا تھا اس کو دس گھنٹے میں تکمیل کرنا؛ تاکہ مزید پیسے ملتے

رہیں اور اس کے معاش کا مسئلہ حل ہوتا رہے، یہ بری سوچ اور ناپسندیدہ عمل ہے، امانت داری کا تقاضا ہے کہ مکمل تندہی سے کام کو انجام دیا جائے پورا وقت اور پوری طاقت اس کے لئے صرف کی جائے، ورنہ وہ مالک کے ساتھ خیانت کرنے کا مرتکب ہوگا اور اس کا بھی حساب روز محشر میں بہر حال دینا ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دولڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لئے پانی بھر دیا تو ان دونوں نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور کہا کہ یہ بڑے امانت دار اور طاقت ور ہیں ان کو اپنے گھر میں ملازم رکھ لیجئے۔ قرآن نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

یَـا أَبَـتِ اسْتَـأْجِـرْهُ إِنَّ خَيْـرَ مَـنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ. (القصص ٢٦)

اے میرے ابا! ان کو مزدور رکھ لیجئے اچھا مزدور وہ ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو۔

اس آیت میں جہاں ملازم اور مزدور کے اوصاف کی طرف رہنمائی کی گئی ہے وہیں اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ مزدور امین ہوتا ہے اسے کام کرتے ہوئے اپنی امانت داری کا مکمل ثبوت دینا چاہئے، اس سے خود اس کی زندگی خوشگوار ہوگی اور غیب سے اس کے رزق کے لئے بہتر انتظام کیا جائے گا۔ □□□

مناجات:

سوا تیرے نہ رہ جائے کوئی بھی جستجو اپنی

مولانا محمد اعظم قاسمی سیتاپوری اُستاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

بچھائی ہیں دو عالم میں نشانی سو بسو اپنی ❖ مرے رب نے نہ رکھی ہے کسی میں بو نہ خو اپنی
گنہ گاروں کو رحمت سے خدایا بخش دے اپنی ❖ بدی کے پل دکھا عظمت ہمارے رو برو اپنی
تلاوت میں مزہ آئے حلاوت ہو نمازوں میں ❖ خلوص و بندگی سے زندگی ہو سرخ رو اپنی
رہوں میں ذکر میں ہر دم، بھلادوں ماسوا تیرے ❖ دکھا دے حسن کو اپنے، سکھادے گفتگو اپنی
بڑھالوں نیکیاں اپنی قیامت میں جو کام آئیں ❖ بٹھالوں دل میں یاد اُس کی، بچالوں آبرو اپنی
مجھے بھی رب تو شامل کر، کرم سے باصفاؤں میں ❖ سوا تیرے نہ رہ جائے کوئی بھی جستجو اپنی
جو رب راضی تو سب راضی، یہاں راضی وہاں راضی ❖ جہاں اپنا جنان اپنی، بہار و گل کی بو اپنی

مٹاؤں نفس کو اپنے کروں تیری عبادت ہی
یہی ہے مدعا اعظم یہی ہے آرزو اپنی

اَولیاتِ صحابہؓ:

حبشہ کے سب سے پہلے مہاجر صحابیؓ

مولانا مفتی ابوجندل قاسمی استاذ حدیث مدرسہ قاسم العلوم تیوڑہ ضلع مظفرنگر یوپی

حبشہ کے سب سے پہلے مہاجر صحابی

اپنے دین کی حفاظت کے لئے سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے اور اپنے وطن کو ترک کرنے والے صحابی کے سلسلے میں تین اقوال ہیں: (۱) ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے مہاجر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع اہلیہ (حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ہیں۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع اہلیہ (حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) ہیں۔ (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ حضرت حاطب بن عمرو بن عبدشمس ہیں۔ (المعجم الکبیر للطبرانی ۱/۹۰، حدیث: ۱۴۳۔ تاریخ دمشق ۳۹/۲۹-۳۰۔ السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۲/۴۔ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ۴/۶۷ باب مایقال عند من حضرہ الموت، ۶/۳۳۹ باب الولیمۃ۔ سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ۲/۹۰۔ عیون الاثر ۲/۳۸۶، ۱/۱۵۱، ذکر الہجرۃ۔ اسد الغابہ، ترجمہ عبداللہ بن عبدالاسد وترجمہ حاطب بن عمرو۔ الاستیعاب ۱/۳۸۶۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر ۱/۵۱، باب ذکر الہجرۃ الی الحبشۃ)

ذیل میں بالترتیب پانچوں صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات تحریر کیے جاتے ہیں:

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام ونسب:- نام عثمان، قبل اسلام کنیت ''ابوعمرو'' تھی، حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے بعد ایک صاحبزادہ ''عبداللہ'' پیدا ہوئے تو پھر ان کے نام پر ''ابوعبداللہ'' کنیت رکھی، ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ آپ کی کنیت آپ کی نرمی کی وجہ سے ''ابولیلیٰ'' تھی، ذوالنورین لقب، والد کا نام عفّان، والدہ کا نام اَرْوٰی، والد کی طرف سے سلسلۂ نسب یہ ہے: عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف بن قصی۔ والدہ کی طرف سے سلسلۂ نسب یہ ہے: اَروٰی بنت کُرَیز بن ربیعہ بن حبیب بن عبدشمس بن عبدمناف بن قصی۔ اِس طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسب پانچویں

پشت میں ''عبدمناف'' پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کی نانی ام حکیم بیضاء بنت عبدالمطلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ محترم حضرت عبداللہ کی حقیقی بہن تھیں، بعض حضرات نے کہا ہے کہ دونوں توأم (جڑواں پیدا ہوئے) تھے، تو گویا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن کے صاحبزادے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے، آپؓ کی والدہ محترمہ صحابیت کے شرف سے مشرف ہوئیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں انتقال ہوا اور آپؓ نے قبر میں اتارا، جب کہ والد ''عفان'' کا زمانۂ جاہلیت میں ہی انتقال ہوگیا تھا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ واقعۂ فیل کے چھٹے سال یعنی سینتالیس قبل ہجرت پیدا ہوئے۔ (فتح الباری/کتاب المناقب ۸/۳۹۵-۳۹۳، طبقات ابن سعد/طبقات البدریین من المہاجرین ۳/۵۱، الاستیعاب/باب عثمان ۲/۱۱، معرفۃ الصحابہ ص ۵۸، تاریخ الخلفاء/نسبہ ومولدہ ولقبہ ۱/۱۳۴)

قبلِ اسلام

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لانے سے پہلے بھی قبیلہ قریش میں بڑی وقعت وعزت رکھتے تھے، جس کی وجہ آپ کے کریمانہ اخلاق تھے، چناں چہ آپ شرافت وسنجیدگی، عفت وپارسائی، دیانت داری وراست بازی، جود وسخا، اور کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے میں معروف تھے، اللہ تعالیٰ نے مالی فراوانی بھی خوب عطا کی تھی جس کے ذریعے فقراء ومساکین، یتیموں وبیواؤں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی وخبر گیری آپ کا نشانِ امتیاز بن گیا تھا، آپ کے اوپر صفت حیا کا بے حد غلبہ تھا، بعض روایات میں ہے کہ اگر کبھی آپ غسل کرنے کے لیے دروازہ بند کرکے کپڑے اتارتے تو غلبۂ حیا کی وجہ سے پشت سیدھی نہیں کرسکتے تھے، آپ کی یہ حیا اسلام لانے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ برقرار رہی بلکہ اس میں مزید اضافہ ہی ہوا، یہاں تک کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور فرشتے بھی صفت حیا کے غلبہ کی وجہ سے آپ کا لحاظ فرماتے تھے، اسی طرح دورِ جاہلیت میں آپ بت پرستی، شراب نوشی اور زنا کاری جیسی عمومی برائیوں کے کبھی قریب بھی نہیں گئے۔ (تاریخ الخلفاء ۱۳۶، صحیح مسلم ۲/۲۷۷، سیرت خلفائے راشدین ۱۶۰)

قبولِ اسلام

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ قدیم الاسلام اور سابقین اولین صحابہ کرامؓ میں سے

ہیں، آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت اور رہنمائی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دارِارقم میں داخل ہونے سے پہلے نعمت اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ اسلام قبول کرنے کا بھی عجیب واقعہ ہے، جس کو حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''ایک مرتبہ میں صحنِ کعبہ میں تھا، اچانک مجھے معلوم ہوا کہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح عتبہ بن ابی لہب سے ہوگیا، یہ سن کر میرے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ کاش میں اس جانب سبقت کرتا، تھوڑی دیر کے بعد میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری خالہ سعدیٰ بنت کریز بیٹھی ہیں جو کہانت کا عمل بھی کرتی تھیں، مجھے دیکھ کر انہوں نے یہ اشعار پڑھے (الاصابہ میں وہ اشعار مذکور ہیں، جن میں انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتایا، نیز یہ کہ ان کی اتباع کامیابی کی ضمانت ہے، اور ایک بہت زیادہ پاک دامن، شریف اور خوبصورت وخوب سیرت عورت سے شادی کی خوش خبری سنائی) فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس میرا اٹھنا بیٹھنا تھا، میں ان کے پاس آیا اور میں اپنی خالہ کی گفتگو سے فکرمند تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے دیکھ کر فکرمندی کا سبب دریافت کیا، میں نے اپنی خالہ کی بات کا ان سے تذکرہ کیا، تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: ''عثمان! تم تو عقل مند وہوشیار آدمی ہو، ذرا غور تو کرو کہ یہ بت پتھر کے ہیں، نہ کچھ دیکھتے بھالتے ہیں، نہ کسی کو کچھ نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں''، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی گفتگو سن کر آپ بارگاہِ نبوت میں حاضری پر آمادہ ہوگئے، اتنے میں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، ساتھ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، جب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کے کان میں کچھ کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''عثمان! خدا کی جنت قبول کر، میں تمہاری اور تمام مخلوق کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوا ہوں''، ان سادہ وصاف جملوں سے متأثر ہوکر میں بے اختیار کلمۂ شہادت پڑھنے لگا اور حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ (الاصابہ فی تمییز الصحابہ/تذکرہ سعدیٰ بنت کریز ۸/۱۷۶-۱۷۸)

ذوالنورین کا لقب

قبول اسلام کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہ شرف حاصل ہوا جو ان کی کتابِ منقبت کا سب سے درخشاں باب ہے، یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی سیدہ رقیہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہا کا دوسرا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا، جن کا نکاح پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوا تھا، مگر بعثت نبوی کے بعد ابولہب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی عداوت ہوگئی تھی کہ اس نے اپنے بیٹے پر دباؤ ڈال کر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دلوادی تھی، پھر غزوۂ بدر کے موقع پر جب حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال ہوگیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک اور صاحبزادی ''سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا'' کا نکاح بھی ماہِ ربیع الاول ۳ھ ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا، جن کا نکاح پہلے ابولہب کے بیٹے عتیبہ سے ہوا تھا، اور اس نے بھی باپ کے کہنے سے طلاق دے دی تھی، پھر جب ماہِ شعبان ۹ھ ہجری میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی وفات پا گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اگر میرے کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں اس کا نکاح بھی عثمانؓ سے کر دیتا''۔ یہ (پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دو صاحب زادیوں سے نکاح) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ عظیم سعادت اور خوش نصیبی ہے جس میں آپ کا کوئی دوسرا ہمسر نہیں، اسی وجہ سے آپ کو ''ذوالنورین'' کہا جاتا ہے، نزال بن سبرہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''ہم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ کچھ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بیان کیجیے، آپ نے فرمایا کہ ''وہ ایسی شخصیت ہیں جن کو ملأ اعلیٰ میں ''ذوالنورین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ (طبقات ابن سعد/ طبقات البدریین من المہاجرین ۵۳/۳، الاصابہ ۳۷۷/۴-۳۷۸، ترجمہ ۵۴۶۴، سیرۃ المصطفیٰ ۳۶۸/۳)

حبشہ کی طرف ہجرت

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کی خبر جیسے ہی ان کے چچا ''حکم بن ابی العاص'' کو ملی تو اس نے آپ کو گرفتار کر کے رسی سے باندھ کر خوب مارا، اور کہا کہ تم نے اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے خدا کی قسم! میں تمہیں اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک تم اس دین کو ترک نہ کر دو جس کو تم نے اختیار کیا ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ: اللہ کی قسم! میں کبھی بھی اس دین کو نہیں چھوڑ سکتا، جب چچا نے دین اسلام پر ان کی یہ مضبوطی دیکھی تو عاجز ہو کر آپ کو رہا کر دیا۔ مگر وقتاً فوقتاً ظلم کرتا رہتا، بالآخر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے اپنی اہلیہ سیدہ رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ساتھ لے کر ملک حبشہ کی طرف روانہ ہوگئے، چناں چہ یہ پہلا قافلہ تھا جو دین وایمان کی

حفاظت کے لیے وطن اور اہل وطن کو چھوڑ کر جلاوطن ہوا، ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا، آپ باہر نکلتے تاکہ کوئی ان کی خبر دے، ایک روز ایک قریشی عورت نے بتلایا کہ میں نے ان دونوں کو اس طرح دیکھا ہے کہ عثمانؓ اپنی اہلیہ کو ایک گدھے پر سوار کر کے اس کو ہانک رہے ہیں اور خود پیدل چل رہے ہیں، یہ سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ عُثْمَانَ اوّلُ مَنْ هَاجَرَ اِلَى اللّٰهِ بِاَهْلِهٖ بَعْدَ لُوْطٍ. (المعجم الكبير للطبراني ۹۰/۱ رقم: ۱۴۳، تاريخ دمشق ۲۹/۳۹-۳۰، السيرة النبويه لابن كثير ۴/۲-۵)

یعنی حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کی۔

ماہِ شوال تک آپ حبشہ میں مقیم رہے، شوال میں یہ خبر سن کر کہ اہل مکہ مسلمان ہوگئے تمام مہاجرین مکہ مکرمہ واپس آگئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی واپس آگئے، مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر یہ خبر غلط معلوم ہوئی، اب مشرکین مکہ نے پہلے سے زیادہ ستانا شروع کیا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی، اور صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے ہجرت کی، جن میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع اہلیہ محترمہ (سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا) بھی تھے۔ (سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ۹۲/۲، سیرت المصطفیٰ ۲۴۳/۱)

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت

اُس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ لوٹ آئے، اور جس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی، تو آپ نے بھی مع اہل وعیال ہجرت فرمائی، اور حضرت اوس ابن ثابتؓ برادر حسان بن ثابتؓ کے مہمان ہوئے، بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں دونوں کے درمیان مؤاخات قائم فرمائی۔ اِسی مؤاخات کی وجہ سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے، اور آپ کی شہادت کے بعد بہت زیادہ روتے تھے۔ (طبقات ابن سعد ۵۳/۳، اسد الغابہ ۵۷۹/۳) رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

❍❖❍

ذکرِ رفتگاں:

بقیۃ الصالحین

حضرت مولانا سید شوکت علی نظیر صاحبؒ امام جامع مسجد ممبئی

مولانا انوار احمد قاسمی مبارک پوری اُستاذ جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن

اُم المدارس دارالعلوم دیوبند نے تبلیغ وارشاد، دعوت واصلاح، جہد وعمل اور تعلیم وتربیت کے میدان میں جو باکمال افراد پیدا کئے ہیں، ان میں ایک روشن نام حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے تلمیذ رشید، بزرگوں واکابر کے منظور نظر، عوام وخواص میں بے حد مقبول ومحترم شخصیت، جامع مسجد بمبئی کے امام وخطیب بقیۃ السلف حضرت مولانا سید شوکت علی نظیر رحمہ اللہ کا ہے جو مورخہ ۲۵؍ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ ۱۰؍اکتوبر ۲۰۱۵ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مولانا ان علماء ربانین میں تھے جو علم وفضل، صلاح وتقوی، اعتدال ونرم روی اور دینی غیرت وحمیت میں ممتاز مقام کے ساتھ امت کی اصلاح وترقی اور مسلمانوں میں دینی روح پھونکنے کے لئے ساری عمر مصروف عمل رہے۔

پیدائش :- حضرت مولانا سید شوکت علی نظیر رحمہ اللہ صوبہ مہاراشٹر کے خطۂ کوکن- جو ممبئی سے متصل ساحلی پٹی کے چار اضلاع ضلع تھانہ، رائے گڈھ (قدیم نام قلابہ) رتنا گیری اور سندھودرگ پر مشتمل ہے- کے ضلع رائے گڈھ کی تاریخی بستی میندری میں ۲۶؍شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ ۶؍جنوری ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ سادات سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا سلسلۂ نسب ۳۳؍واسطوں سے حضرت حسینؓ سے جا ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم :- والد محترم کا سایۂ رحمت مولانا کی کم عمری میں اٹھ گیا تھا، دادا مرحوم کی سرپرستی میں اسکول کی ابتدائی تعلیم چوتھی جماعت تک گاؤں کے اسکول میں حاصل کی، اس دور افتادہ علاقے میں کوئی دینی مدرسہ نہ تھا، دین سے عموماً دوری تھی اور ناواقفیت کی وجہ سے بدعات وخرافات کو اصل دین سمجھا جاتا تھا، پس دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ کو جامعہ حسینیہ راندیر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا، آپ راندیر گجرات کے لیے روانہ ہوگئے، علم کو حاصل کرنے کی لگن اور تڑپ نے مولانا کو مسلسل چار سال وہیں رہنے اور تعطیلات میں بھی گھر نہ آنے پر آمادہ کیا۔ جامعہ حسینیہ راندیر کے مہتمم مولانا محمد سعید راندیریؒ جو بڑے جلالی شان کے مہتمم تھے، مولانا سے بے حد محبت فرماتے تھے، گھر سے آپ کے لیے روٹی اور کھانا چپکے سے لاتے اور کھلاتے،

اس کے بعد مدرسہ انوار العلوم احمد آباد میں ایک سال رہے، اس دوران دو سال کی کتابیں پڑھیں۔

دار العلوم دیوبند میں:- پھر آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے رشد وہدایت کی عظیم درس گاہ دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے، حضرت مولانا کی خوش نصیبی کہ انھوں نے وہاں ایسے اساطین علم فضل سے اکتساب فیض کیا جو زہد وتقوی، رسوخ فی العلم سے لے کر دین وملت کے لیے جہد وعمل اور جاں نثاری وسرفروشی کی اعلیٰ مثال تھے۔ دورۂ حدیث میں آپ نے صحیح بخاری شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے، صحیح مسلم امام المعقول والمنقول حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے، سنن ترمذی، سنن ابوداؤد اور شمائل ترمذی شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ سے، سنن نسائی، طحاوی اور موطا امام مالک حضرت مولانا فخر الحسنؒ سے، موطا امام محمد حضرت مولانا محمد جلیلؒ سے اور ابن ماجہ حضرت مولانا ظہور احمدؒ سے پڑھیں۔ آپ نے ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۴ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور دورۂ حدیث میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔

اساتذہ کی شفقت:- آپ ایک ذی استعداد اور نیک وصالح طالب علم تھے اور غیر سنجیدہ حرکات، لہو ولعب اور خرافات ولغویات سے پاک تھے، علم کی نافعیت اور عمل کی صالحیت حاصل کرنے کی دھن تھی، اس لیے مشفق اساتذہ کی توجہات آپ پر تھیں، آپ کو حضرت مدنی قدس سرہ سے بڑی عقیدت و محبت تھی اور حضرت مدنیؒ کی آپ پر شفقتیں وعنایتیں بے پایاں تھیں، آپ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علمی اور روحانی استفادہ کرتے، حضرت مدنیؒ عمر کے اخیر حصے میں خطۂ کوکن میں رشد وہدایت پھیلانے کے لیے تشریف لائے، تو معلوم ہوا کہ یہاں سادات کی ایک بستی ''میندری'' ہے، تو حضرت مدنیؒ وہاں تشریف لے گئے، مولانا اس وقت دار العلوم میں زیر تعلیم تھے، حضرت مدنیؒ نے واپسی پر فرمایا کہ میں تمہارے گاؤں گیا تھا۔ حضرت مدنیؒ کو وہاں کے چمپا کا پھول بڑا پسند آیا، تو جب مولانا گھر آئے تو چمپا کا پھول سرکہ میں ڈال کر لے گئے اور حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کیا، جو حضرت مدنیؒ کی حیات تک تازہ رہا اور جب حضرت مدنیؒ کی وفات ہوئی تو وہ مرجھا کر کالا ہوگیا۔ مولانا اس خطہ میں حضرت مدنیؒ کی آمد کے واقعات خوب مزے لے لے کر سناتے اور ہم سب مسحور ہوکر سنتے رہتے، حضرت مدنیؒ کا نام وتذکرہ اور ان کے مجاہدانہ واقعات کی داستان مولانا کی زبان سے سنتے تو کچھ اور ہی لطف آتا۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے خانوادے سے آپ کا بے حد خلوص ومحبت پر مبنی تعلق تھا، فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ اور خانوادہ کے دیگر افراد کا بڑا احترام واکرام فرماتے تھے۔

میدانِ عمل میں :- مولانا نے فراغت کے بعد ایک سال تک گاؤں میں رہ کر دین کی خدمات انجام دیں اور لوگوں میں دینی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، پھر جامع مسجد بمبئی کے امام وخطیب مولانا غلام محمد خطیب صاحب کے ایماء پر بنگالی پورہ مسجد بمبئی میں ایک سال امامت کی خدمت انجام دی۔

تدریس جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل:- مولانا کی استعداد وصلاحیت اعلیٰ درجہ کی تھی، وہیں صلاح وتقوی میں بھی ممتاز تھے، پس تقدیرِ الٰہی آپ کو تدریس کے لیے گجرات کے مشہور تعلیمی ادارے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کی علمی فضا میں لے گئی، وہاں مولانا نے تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی دینی واخلاقی تربیت کی فکریں کیں اور بڑے خلوص ومستعدی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیں، مولانا کا طلبہ میں ایک مقام تھا کئی واقعات شاہد ہیں کہ طلبہ مولانا کا بے حد ادب واحترام کرتے تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علم واخلاص کا یہ ستارہ بہت ترقی کرے گا اور درس وتدریس کی اعلی مسندوں کو زینت بخشے گا کہ اچانک جامع مسجد بمبئی کے امام وخطیب مولانا غلام محمد خطیب نے مہتمم جامعہ کے نام بار بار خط لکھا، پھر تار دیا کہ ڈابھیل سے مولانا کو بھیج دیا جائے، تو مہتمم صاحب نے بادلِ ناخواستہ اجازت دی، آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تاریخ کے مطابق شوال ۱۳۷۹ھ سے ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ تک تدریسی خدمت انجام دی۔ (تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ۴۳۲)

اِمامت وخطابت جامع مسجد بمبئی :- جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے بعد جامع مسجد بمبئی میں ۷۵/روپئے کی تنخواہ پر امامت کی ذمہ داری سنبھالی اور اسی کے ساتھ مدرسہ محمدیہ میں عربی استاذ کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ بھی تدریس میں آپ کے رفیق تھے۔

مولانا نے تقریباً ۵۲/سال اس شان ووقار کے ساتھ امامت کی کہ آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی، لوگوں کے دلوں میں آپ کی جو عظمت ومحبت تھی، وہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ اس منصب پر رہتے ہوئے اپنے کردار وعمل کے ذریعہ عوام وخواص ہر ایک کے لیے نمونۂ عمل بنے اور نازک سے نازک مواقع پر بھی اشتعال وجذباتیت سے ہٹ کر صالح فکر کیساتھ امت کی صحیح راہنمائی فرمائی۔ آپ خطبات موقع ومحل اور حالاتِ حاضرہ کی مناسبت سے تیار کرتے تھے۔ جب سلمان رشدی کا فتنہ اٹھا اور امت کی فکری بنیادوں کو نقصان پہنچے کا اندیشہ ہوا، تو آپ نے مسلسل ۵۲/خطبات صحابہ کرامؓ کی عظمت وفضیلت پر دیئے جو علم وفضل کا شاہکار ہیں۔ آپ کے خطبات مختصر وقت میں قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل ہوتے،

وقت کا اتنا خیال رکھتے کہ مقررہ وقت کے اندر ہی نماز وخطبات ختم ہوجاتے۔ کتنے ہی لوگ دور دراز سے سفر کرکے صرف مولانا کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آتے، عرب حضرات بھی جو بمبئی میں تجارت و علاج وغیرہ کی غرض سے آتے نماز میں شریک ہوتے اور مولانا کے خطبات سے متأثر ہوتے۔ حضرات شیوخ الازہر، شاہ فیصل، شیخ محمد بن عبداللہ السبیل، شیخ عائض القرنی اور بھی بہت سے عرب علماء ومشائخ نے مولانا کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کی اور مولانا کے بلند مقام کے معترف تھے۔

نماز جمعہ میں حضرت مولانا جب خطبہ دینے کے لیے تشریف لاتے تو مصلیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بمبئی کی سب سے بڑی جامع مسجد میں عجیب روحانی منظر ہوتا، ایک خطیب اسلامی عظمت ووقار کے ساتھ کھڑا ہوتا، اذان ہوتی پھر خطبہ شروع ہوجاتا، نماز کے بعد عربی خطبہ کا عمدہ انداز میں ترجمہ پیش فرماتے اور اگر کوئی نکاح ہوتا تو خطبۂ نکاح پڑھتے، پھر ملاقات کرنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا جو مولانا سے مصافحہ کرنے کے لیے قطار میں کھڑا ہوجاتا، مصلیوں کا مرکز عقیدت مولانا کی ذات گرامی ہوتی، وہ بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ مولانا سے مصافحہ کرتے، مجمع کبھی اتنا زیادہ ہوتا کہ اس عمل میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا، لیکن مولانا ہر ایک سے بڑی خندہ پیشانی سے مصافحہ وملاقات کرتے تھے۔

اجازت وخلافت :- اِحسان وتصوف دین کا ایک حصہ ہے، مولانا اس درس گاہ کے فیض یافتہ تھے جہاں ایک وقت شیخ الحدیث سے لے کر دربان تک بھی صاحب نسبت بزرگ ہوا کرتے تھے، مولانا کا اصلاحی تعلق فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ سے تھا، حضرت مفتی صاحب نے آپ کو چند دنوں کے لیے دارالعلوم دیوبند بلایا اور اجازت وخلافت سے مشرف فرمایا۔ مفتی فاروق صاحب میرٹھیؒ نے حضرت مفتی صاحب کے خلفاء کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے، جس میں حضرت مولانا شوکت صاحب کا نام چالیسویں نمبر پر ہے۔ (حیات محمود ۲/۴۴۹)

پھر شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے خلیفۂ خاص حضرت مولانا احمد علی آسامیؒ نے بھی آپ کو خلافت و اجازت مرحمت فرمائی، لیکن حضرت مولانا اپنے آپ کو چھپاتے تھے اور ظاہر نہ فرماتے تھے کہ آپ کو اجازت وخلافت حاصل ہے۔

اکابر علماء سے تعلق:- بمبئی کو یہ فخر ہے کہ یہاں اکابر اہل اللہ مختلف وجوہات کی بنا پر تشریف لاتے رہے ہیں اور بمبئی کو ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے، مولانا کو اپنے بزرگوں سے بڑی

گہری وابستگی تھی، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری، مولانا عبدالشکور فاروقی، مولانا قاری محمد طیب، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، مولانا احمد علی آسامی، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، مولانا قاری صدیق احمد باندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید اسعد مدنی، مولانا ابرارالحق ہردوئی، مولانا قاری امیر حسن ہردوئی رحمہم اللہ اور دیگر بزرگوں سے بڑے اعتماد ومحبت کا تعلق تھا۔ آپ اپنی صالحیت وصلاحیت کی وجہ سے اکابر کے منظور نظر رہے، معاصر اکابر سے بھی بڑے اچھے روابط تھے اور افادہ واستفادہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن سے تعلق:- خطۂ کوکن میں ایک زمانے میں شرک وبدعات کا دور دورہ تھا، لوگ دین سے اتنے دور ہو چکے تھے کہ بدعات وخرافات کے لیے مرنے مارنے پر تُل جاتے تھے، اس علاقہ میں کوئی مدرسہ نہ تھا، عالم اور حافظ بمشکل چند تھے، لیکن حق تعالیٰ کو ایک بار پھر اس خطہ سے دین کی ہوائیں چلانی تھیں اور اس علاقہ کو دین سے معمور کرنا تھا، چناں چہ تقدیر الٰہی سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی اس خطہ میں آمد ہوئی، اس وقت ان کے وعظ وارشاد کی روشنی سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ منور ہو رہا تھا، عمر کے آخری حصہ میں حضرتؒ کا کوکن جیسے دور دراز خطہ میں جہاں سڑکیں نہیں تھی، اونچے نیچے، دشوار گزار پہاڑی راستوں پر بیل گاڑیوں کا سفر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن حق تعالیٰ نے انھیں اخلاص وللّٰہیت، دین کی تڑپ اور دین کے لیے قربانی وسرفروشی کے عظیم جذبہ سے نوازا تھا، جس کے سامنے پہاڑ بھی رائی ہو جاتے تھے۔

حضرت مدنیؒ تشریف لائے اور یہاں کے لوگوں کو سنت وشریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی نصیحت فرمائی اور خاص طور سے قرآن کی تعلیم عام کرنے اور داڑھی رکھنے پر خاص زور دیا۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ بھی اس سفر میں حضرت مدنیؒ کے ساتھ تھے، وہ رودادِ سفر میں لکھتے ہیں: ''راقم بھی قافلہ کے ساتھ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم وروحانیت کی بارات نکل رہی ہے، اس دن جہاز مدرسہ اور خانقاہ معلوم ہوتا تھا، کوکن اور بمبئی کے متوسلین ومعتقدین ہم سفر تھے، جہاز کا پورا عملہ ہمہ تن خدمت بنا ہوا تھا، حضرت مولانا نے اس سفر میں قرآن کی تعلیم عام کرنے اور شکل وصورت شرعی بنانے پر بے حد زور دیا تھا اور ان کا پورا وعظ اسی موضوع پر ہوا تھا''۔ (قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے ۲۲۲)

خدا جانے حضرت مدنیؒ کا کیسا اخلاص رہا ہوگا، کیسی دین کی تڑپ رہی ہوگی کہ ان کی آمد سے علاقے کے حالات بدل گئے، جہالت وبدعات کا دور ختم ہوا اور علمِ دین کی روشنی گھر گھر پہنچنے لگی۔

جمعہ کا دن تھا، شریوردھن میں فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ سجدہ کی تلاوت نہیں فرمائی، حضرت مدنیؒ نے نماز کے بعد سوال کیا کہ یہاں کتنے عالم ہیں؟ جواب ملا: یہاں کوئی عالم اور حافظ نہیں ہے، حضرت والا نے اپنے خاص انداز میں فرمایا: ''یہاں مدرسہ کی بنیاد ڈالو، مجھے یہاں سے علم کی خوشبو آرہی ہے''۔ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں، یہ مقبولیت کی گھڑی تھی، ایک اللہ والے کے دل سے نکلے ہوئے الفاظ بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت سے ہمکنار ہوئے اور ایک دینی مدرسہ کے قیام کی راہیں ہموار ہونے لگیں، حضرت مدنیؒ سے اصلاحی تعلق رکھنے والے جناب حاجی عبد الرحیم صاحب بروڈؒ رمضان گزارنے کے لئے دیوبند جاتے تھے، وہیں آپ کے دولت کدے پر اس مدرسہ کے تعلق سے مشورہ ہوا اور پھر اس خطہ کی اولیں اسلامی درس گاہ کی بنیاد رکھی گئی اور حضرت مدنیؒ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کا نام ''مدرسہ حسینیہ عربیہ'' رکھا گیا۔

یہ مدرسہ مولانا کے شیخ و مربی کی یادگار بھی تھا اور وطنی نسبت و تعلق کا حامل بھی، اس لیے ابتداء ہی سے مولانا کو اس مدرسہ سے تعلق رہا اور یہ تعلق و محبت اتنا بڑھا کہ مولانا کا نام ہی اس کا تعارف بن گیا تھا، بہت سارے لوگ مدرسہ کا نام لینے کے بجائے اسے مولانا شوکت صاحب کا مدرسہ کہتے تھے۔ مولانا منصبِ امامت کی وجہ سے گرچہ بمبئی میں رہتے تھے، لیکن مدرسہ کے حالات اور تعلیمی سرگرمیوں سے باخبر اور مدرسہ کی تعمیر و ترقی کے لیے فکرمند رہا کرتے تھے، اکابر اہل اللہ کی توجہات اور مولانا کی فکروں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ مدرسہ اس پورے علاقے میں فقہ شافعی کا مرکزی جامعہ بن چکا ہے، جہاں ناظرۂ قرآن سے لے کر تخصصات تک تعلیم ہو رہی ہے، نیز دارالافتاء و دارالقضاء بھی فقہ شافعی کے مطابق خدمات انجام دے رہے ہیں، یہاں کیرالا، تامل ناڈو اور مہاراشٹر و حیدرآباد اور دیگر علاقوں کے طلبہ فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔

مولانا کو جامعہ، اس کے اساتذہ و طلبہ اور اس کے در و دیوار سے حد سے زیادہ محبت تھی، جب تک قویٰ مضبوط تھے، جامعہ میں بڑی کثرت سے تشریف لاتے، دو تین دن قیام فرماتے جب بھی گھر آتے تو جامعہ میں ضرور تشریف لاتے، صحت کے ایام میں تو ابھی شام میں گھر پہنچے کہ دوسرے دن صبح جامعہ میں موجود۔ مولانا کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ جب سکون کی تلاش ہوتی ہے تو ہم جامعہ میں آتے ہیں۔ جب جامعہ میں تشریف لاتے تو عید کا سماں ہوتا، ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے در و دیوار پر رونق و بہار آگئی ہو۔ ہر فرد کے چہرہ پر خوشی و رونق کے آثار ہوتے، اساتذہ ان کی خدمت میں حاضری کے لیے بے تاب تو طلبہ پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے، ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ وہ مولانا کی خدمت سے مستفید ہو۔ اساتذہ سے دفتر اور

مہمان خانے میں ملاقات ہوتی، آپ ان کی بات سنتے اپنی بات کہتے۔ مزاحیہ اور ایسے برمحل جملے کہتے کہ پوری محفل زعفران زار ہو جاتی، طلبہ سے انفرادی واجتماعی ملاقاتیں ہوتیں۔

سالہا سال سے جامعہ کے اجلاس آپ ہی کی سرپرستی میں منعقد ہوتے، آپ ان جلسوں میں پابندی سے تشریف لاتے، ایسا محسوس ہوتا کہ چہرہ پر انوارِ الٰہی کا خاص فیضان ہو رہا ہو۔ سب سامعین کی نگاہیں عقیدت ومحبت سے آپ کی طرف لگی رہتیں، جلسہ کے اخیر میں آپ مختصر الفاظ میں چند نصیحتیں کرتے جو آپ کی طرف سے ہر ایک کے لیے پیغام بھی ہوتیں اور بیش قیمت سرمایۂ زندگی بھی۔

آپ کی خواہش تھی کہ مدرسہ کا ہر بچہ علم میں بھی مثالی ہو اور تہذیب وشائستگی کا پیکر بھی، اس لیے بچوں کی مختلف پیرائے سے تربیت فرماتے۔ عموماً عصر کے بعد مجلس ہوتی، بیان مختصر اور واقعی ماقلّ ودلّ کا مصداق ہوتا، ظرافت آمیز انداز میں طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت فرماتے، طلبہ سے سوالات پوچھتے، علم وعمل کے گہرے نکتے بتاتے، کامیاب زندگی گزارنے کے آداب وطریقے پر روشنی ڈالتے، سنتوں کی پابندی کی تنبیہ کرتے، صحابہ کرام واسلاف واکابر کے واقعات سناتے، اس کے پس منظر میں نصیحتیں کرتے، روتے بھی رُلاتے بھی، نبی کریم ﷺ کی موقع موقع سے بتائی ہوئی دعائیں یاد کراتے۔ مولانا کی دل آویز شخصیت، بزرگی وعظمت، پدرانہ شفقت ومحبت کی وجہ سے یہ باتیں بچوں کے دلوں میں سیدھے اتر جاتیں۔ مولانا کا حافظہ بھی غضب کا تھا، پیرانہ سالی کے زمانہ میں بھی ان کے حافظہ میں محفوظ ہوتا تھا کہ پچھلے بیان میں کیا باتیں ارشاد فرمائیں تھیں۔

مولانا کا ایک بڑا نایاب وصف محنتی اساتذہ وکارکنان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا، طلبہ کو اساتذہ کی قدر کرنے اور ان سے خوب استفادہ کرنے پر ابھارتے، اسی طرح خود بچوں کے سامنے اساتذہ کی تعریف اور مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کرتے جس سے اساتذہ اور زیادہ محنت وتندہی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے۔

اَوصافِ حمیدہ :- مولانا تواضع وانکساری، حلم وبردباری، اخلاص وبے لوثی، زہد واستغناء، اتباع سنت اور ورع وتقویٰ میں اسلاف کی سچی یادگار تھے، آپ کو دیکھ کر سلفِ صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، چہرے پر معصومیت، دراز قد، باوقار سراپا، گفتگو میں نرمی، برتاؤ میں شائستگی، عالمانہ متانت اور خوش طبعی ومحبت کی ادا دلوں کو موہ لیتی تھی۔

استغناء :- مولانا خودداری واستغنا کا ایک کامل نمونہ تھے۔عروس البلاد بمبئی،فلک بوس عمارتوں اور تجارتی منڈیوں کی وجہ سے ہندوستان کا دل مانا جاتا ہے،مولانا جس علاقے میں رہتے تھے وہ بمبئی کا قلب ہے، ہرطرف تجارت گاہ اور مال و دولت کی ریل پیل ہے،صبح وشام دنیا کمانے کی گویا ایک ہوڑ مچی ہوئی ہے،ایسے ماحول میں دنیاوی چمک دمک سے صحیح سلامت دامن بچا کر نکل جانا ایک کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔مولانا نے ساری زندگی بمبئی میں گزاری،لیکن اس کی رنگینیاں کبھی آپ کو متاثر نہ کرسکیں،مولانا اگر دولت کے متلاشی ہوتے کروڑوں روپیہ ان کے بینک بیلنس کی صورت میں موجود ہوتا اور فلیٹ وجائیداد کی تفصیلات سنبھالنا مشکل،لیکن مولانا کی بے نفسی، بے ریائی اور مال ودولت سے بے اعتنائی اس حدتک تھی کہ وہاں اپنا ایک ذاتی گھر بھی نہ بنایا،مسجد ہی کے مکان میں رہے،حالانکہ آپ کے چاہنے والوں اور آپ پر اپنا سب کچھ قربان کرنے والوں کی کچھ کمی نہ تھی،لوگ پیش کش کرتے رہے،لیکن مولانا نے کبھی قبول نہ فرمایا۔

اخفائے حال:- پچھلی سطور میں ذکر کیا جاچکا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اکابر کا اعتماد حاصل تھا، بہت سارے واقعات ہیں؛لیکن حضرت مولانا ان واقعات کا تذکرہ پسند نہیں فرماتے تھے،آپ شہرت کی طلب، نیک نامی کی خواہش،اپنے کو بزرگ شخصیت پیش کرنے سے بے نیاز اور ستائش کی تمنا سے بالکل دور تھے۔

خشیت:- خوف وخشیت میں مولانا کا وصف نرالا تھا،ابھی مولانا بذلہ سنجی وخوش طبعی کی کیفیت میں ہیں تو ابھی پل بھر میں خوف وخشیت کا جلوہ ہوجاتا اور رقت طاری ہوجاتی۔جامعہ میں جب خطاب فرماتے تو بات بات پر آنکھیں چھلک پڑتیں،جلسہ میں قرآن کی تلاوت ہوتی اور مولانا کی آنکھیں آنسو برسانے لگتیں۔اخیر زمانے میں خصوصیت کے ساتھ دیکھا گیا کہ قرآن کریم کی تلاوت ہورہی ہے اور مولانا کی آنکھیں چھلک رہی ہیں اور دل کی کیفیت آنکھوں کے ذریعہ باہر آرہی ہے،مقرر کا بیان جاری ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم،صحابہ کرام اور اسلاف کے واقعات بیان ہورہے ہیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔مولانا کبھی خود کسی طالب علم سے فرمائش کرکے قرآن سنتے،ابھی گذشتہ سال مولانا کی طبیعت بہت خراب تھی،لیکن جب سنا کہ جامعہ میں تجوید وقرأت کا جلسہ ہے،تو کہا کہ مجھے ضرور جانا ہے،تشریف لائے اور جامعہ کے مہمان خانہ میں چند لوگوں کی موجودگی میں جامعہ کے ایک فاضل سے قرآن پڑھنے کی فرمائش کی،تلاوت شروع ہوئی اور ادھر مولانا پر گریہ طاری ہوا،اور آپ دیر تک روتے رہے۔

مقبولیت ومحبوبیت:- علم وعمل کی جامعیت، صلاح وتقویٰ کی وجہ سے حق تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ مقبولیت سے نوازا تھا اور اس دیار میں مرجع خلائق کی حیثیت رکھتے تھے، ہر طبقہ اور ہر مسلک والے بلکہ غیر مسلم بھی آپ کا ادب واحترام کرتے تھے، دنیادار طبقہ بھی آپ کے قدموں میں گرتا تھا، لوگ آپ کے پاس اپنے معاشرتی، تجارتی مسائل حل کرنے کے لیے لاتے اور مولانا کا فیصلہ ان کے لیے حرفِ آخر ہوتا۔ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں: بمبئی کی سب سے بڑی جامع مسجد کے امام وخطیب حضرت مولانا شوکت صاحب مدظلہ اس وقت بمبئی میں سب سے زیادہ معمر بزرگ ہیں، جن پر علاقے کے تمام مسلمان اعتماد کرتے ہیں۔ آج کل وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے ہیں، ہمارا خیال تھا کہ عصر کی نماز اُن کی مسجد میں پڑھ کر ان کی زیارت اور عیادت کی سعادت حاصل کریں گے؛ لیکن ہجوم کی وجہ سے ہمیں نکلنے میں دیر ہوئی، اور جماعت ہوٹل ہی میں کرنی پڑی۔ نماز کے فوراً بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہمارے آنے کی خبر سن کر بذاتِ خود ہوٹل کی نچلی منزل میں تشریف لا چکے ہیں''۔ (سفر در سفر: ۳۰۰)

یہ حضرت مولانا کی برکت تھی کہ اس دشوار گذار کوہ دمن میں بزرگانِ دین اور علماء واکابر کی آمد ہوتی رہتی تھی، پچھلے دو سالوں میں حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا یوسف متالا صاحب، مولانا محمد ابراہیم پانڈور، مولانا مفتی احمد خانپوری، مولانا عبدالرزاق بھوپال، مولانا محمد سلمان مظاہر علوم سہارنپور، مولانا عبدالعلیم فاروقی، مولانا محمود مدنی، مولانا بدرالدین اجمل، مولانا احمد بزرگ مہتمم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل دامت برکاتہم العالیہ اور نہ جانے کتنے علماء واکابر حضرت مولانا کی عیادت وملاقات کے لئے ''میندری'' تشریف لاتے رہے، اس بہانے اُن میں سے اکثر کی جامعہ حسینیہ میں بھی آمد ہوتی، ان حضرات کی ملاقات اور ان کی زیارت ہم سب کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی جس سے دیدہ ودل شاداب ہوتے تھے۔

مولانا کی وفات امت کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے۔ **اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وادخلہ الجنۃ**۔ آمین۔

❍❖❍

کتاب المسائل:

رجعت سے متعلق مسائل

مفتی محمد سلمان منصور پوری

رجعت کی تعریف

رجعت کے معنی ''واپسی'' کے آتے ہیں، اور اصطلاحِ فقہ میں رجعت کا مطلب یہ ہے کہ ایک یا دو طلاق دینے کے بعد عدت گذرنے سے پہلے پہلے شوہر کا بیوی کو اپنے نکاح میں برقرار رکھنا، خواہ الفاظِ رجعت کے ذریعہ سے ہو یا کسی ایسے فعل کے ذریعہ ہو جو میاں بیوی کے درمیان جائز ہو، اور جس سے حرمتِ مصاہرت ثابت ہوتی ہو۔ (مثلاً: بوسہ لینا، شہوت کے ساتھ چھونا یا دیکھنا وغیرہ)

هي استدامة الملك القائم بلا عوض ما دامت في العدة أي عدة الدخول حقيقة أي الوطء إذ لا رجعة في عدة الخلوة، وبالفعل مع الكراهة بكل ما يوجب حرمة المصاهرة كمس ولو منها الخ.

(الدر المختار مع الشامي ۲۳/۵-۲۵ زكريا، الفتاوىٰ التاتارخانية ۱۳۸/۵ رقم: ۷٤۷۸ زكريا)

رجعت کے حکم کی حکمت و مصلحت

طلاقِ رجعی کے بعد رجعت کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ اکثر آدمی غصہ میں طلاق تو دے دیتا ہے؛ لیکن بعد میں بڑی ندامت ہوتی ہے، اِس لئے رجعت کا اختیار دیا گیا؛ تاکہ ندامت کی تلافی ہو سکے، اور رجعت میں دو طلاق کی تحدید کی مصلحت یہ ہے کہ اگر یہ تحدید نہ ہو تو بے چاری عورت مسلسل قیدی بنی رہے گی کہ نہ تو شوہر اُس کے ساتھ انصاف کرے گا اور نہ آزاد ہو کر دوسری جگہ باعزت زندگی گذارنے کا موقع ہوگا، جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے تھے، پھر عدت کے اندر رجعت کر لیتے تھے، اور اِس سلسلہ کی کوئی حد نہ تھی، جتنی بار چاہتے طلاق دیتے، اور پھر بار بار رجعت کرتے رہتے تھے۔ پس اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس ظالمانہ رواج کو ختم فرماتے ہوئے یہ ہدایت دی کہ اِسلام میں طلاقِ رجعی کی حد صرف دو بار ہے، یعنی پہلی اور دوسری طلاق کے بعد شوہر کو رجعت کا حق حاصل ہے، اور تیسری طلاق کے بعد بلا حلالہ رجعت کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

چناں چہ اُم المؤمنین سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنی بیوی کو جتنی چاہتے طلاق دیتے، پھر اگر وہ عدت میں رجعت کر لیتے تو وہ اُسی کی بیوی رہتی تھی، اگرچہ سو یا اُس سے زیادہ مرتبہ اُسے طلاق دی ہو، تو ایک شخص نے اپنی بیوی سے قسم کھا کر یہ کہا کہ: ''نہ تو میں تجھے طلاق دے کر اپنے سے الگ کروں گا اور نہ تجھے کبھی اپنے ساتھ رکھوں گا''۔ تو اُس کی بیوی نے پوچھا کہ: ''یہ کیسے ہوگا؟'' تو اُس نے جواب دیا کہ: ''میں تجھے طلاق دوں گا، پھر جب تیری عدت پوری ہونے کو ہوگی تو میں تجھ سے رجعت کر لوں گا''۔ چناں چہ وہ عورت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور آپ کو پوری بات بتلائی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خاموش

رہیں؛ تا آں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، تو آپ کو اِس واقعہ کی خبر دی، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی خاموش رہے، حتیٰ کہ قرآن کی آیت: ﴿اَلطَّلاَقُ مَرَّتٰنِ، فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرۃ، جزء آیت: ۲۲۹] (یعنی طلاق رجعی دو بار تک ہے، اُس کے بعد یا تو دستور کے موافق رو کے رکھے یعنی رجعت کرلے، یا خوش اُسلوبی کے ساتھ چھوڑ دے) نازل ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ''اِس آیت کے بعد سے لوگ طلاق دینے میں محتاط ہو گئے''۔ (ترمذی شریف ۱/۲۲۶، رحمۃ اللہ الواسعہ ۵/۱۴۶)

نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں آدمی تین طلاق کے باوجود رجعت کا حق رکھتا تھا، پھر آیت: ﴿اَلطَّلاَقُ مَرَّتٰنِ﴾ نے اِس رواج پر بند لگا دیا۔ (ابوداؤد شریف ۱/۲۹۷)

خلاصہ یہ ہے کہ رجعت کے بارے میں اِسلامی اَحکام فطری تقاضوں کے عین موافق ہیں، اِسلام یہ چاہتا ہے کہ ضرورت کی تکمیل بھی ہو اور کسی فریق کو نقصان بھی نہ ہو، اگر زوجین ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو بخوشی ساتھ رہیں اور اگر الگ ہونے ہی میں مصلحت ہے تو ناچاقی کے بغیر الگ ہو جائیں، اور ہر طرف کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی خلل نہ ہو، جیسا کہ اِرشادِ خداوندی ہے: ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلاَحًا﴾ [البقرۃ، جزء آیت: ۲۲۸] (اور ان کے شوہر عدت کے اندر اندر اُنہیں لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ اچھی طرح رہنے کا ارادہ کریں) اور سورۂ طلاق میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِکُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِنْکُمْ وَاَقِیْمُوْا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ [الطلاق: ۲] (پھر جب وہ عورتیں اپنی عدت کے قریب پہنچیں تو یا تو اُن کو دستور کے موافق رکھ لو، یا دستور کے موافق چھوڑ دو، اور اپنے میں سے دو معتبر گواہ کرلو، اور اللہ کے واسطے سیدھی گواہی ادا کرو)

ذیل میں رجعت سے متعلق چند اَہم مسائل درج کئے جا رہے ہیں:

رجعت کا مستحب طریقہ

رجعت کرنے کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ زبان سے الفاظِ رجعت کہہ کر بیوی کو خبر دے کہے اور اُس پر گواہ بنالے؛ تا کہ بعد میں نزاع نہ ہو۔ (اور بیوی لاعلمی کی بنا پر اپنے حساب سے عدت کے بعد دوسرا نکاح نہ کر سکے)

وندب إعلامها بها لئلا تنكح غيره بعد العدة (الدر المختار) فالسني أن يراجعها بالقول ويشهد على رجعتها ويعلمها، ولو راجعها بالقول ولم يشهد أو أشهد ولم يعلمها كان مخالفًا للسنة، كما في شرح الطحاوي. (الدر المختار مع الشامي ۵/۲۸ زكريا، الفتاوىٰ التاتارخانية ۵/۱۳۸ رقم: ۷۴۷۸ زكريا)

رجعت کے لئے میاں بیوی کی رضامندی شرط نہیں

رجعت کے لئے بیوی کا راضی ہونا شرط نہیں؛ بلکہ بیوی کی ناگواری کے باوجود بھی شوہر اُس سے رجعت کرسکتا ہے۔ اِسی طرح اگر شوہر کو رجعت کرنے پر مجبور کیا گیا اور بالجبر اس سے رجعت کرالی گئی تو بھی رجعت درست ہوجائے گی اور بیوی اس کے نکاح سے نہیں نکلے گی۔

وفي الصيرفية بأن الرضا ليس بشرط ولهٰذا لو أكره على الرجعة بالفعل يصح. (شامي ٢٦/٥ زكريا) **وتصح الرجعة مع الإكراه.** (الفتاوىٰ الهندية ٤٧٠/١ زكريا) **وإذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية فله أن يراجعها في عدتها رضيت بذٰلك أولم ترض، كذا في الهداية.** (الفتاوىٰ الهندية ٤٧٠/١ زكريا) **ولا تشترط لصحتها شرائط النكاح من الإشهاد ورضا المرأة.** (الفتاوىٰ التاتارخانية ١٣٨/٥ رقم: ٧٤٧٨ زكريا)

رجعت کی پانچ شرطیں

صرف طلاقِ رجعی میں عدت کے دوران رجعت کرنا جائز ہے اور طلاق رجعی اسی وقت کہلائے گی جب کہ اُس میں درج ذیل پانچ باتیں ملحوظ ہوں:

(۱) آزاد عورت میں ایک یا دو صریح طلاق ہوں، تین نہ ہوں۔

(۲) مال کے بدلے طلاق نہ دی ہو۔

(۳) طلاق کو کسی صفت سے متصف نہ کیا ہو۔

(۴) طلاق کو کسی چیز سے تشبیہ نہ دی ہو۔

(۵) طلاقِ کنائی نہ ہو۔

اِن پانچ شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو طلاق رجعی نہیں رہے گی؛ بلکہ بائن یا مغلظہ ہوجائے گی، اور حسبِ شرائط تجدید نکاح کے بغیر آپس میں رشتہ نکاح قائم نہ ہوگا۔

ولها شروط خمس تعلم بالتأمل، قلت: هي أن لا يكون الطلاق ثلاثًا في الحرة أو ثنتين في الأمة، ولا واحدة مقترنة بعوض مالي، ولا بصفة تنبئ عن البينونة كطويلة أو شديدة، ولا مشبهة كطلقة مثل الجبل، ولا كناية يقع بها بائن ولا يخفى أن الشرط واحد

هو كون الطلاق رجعياً، وهٰذه شروط كونه رجعياً متى فقد منها شرطاً كان بائناً. (شامي ٢٦/٥ زكريا)

رجعت کا اختیار کب تک ہے؟

طلاق رجعی میں رجعت کا اختیار صرف عدت (تین ماہواری یا وضع حمل) تک ہے، عدت گذرنے سے پہلے پہلے رجعت نہ کی تو بیوی نکاح سے نکل جائے گی۔

وإذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية أو تطليقتين فله أن يراجعها في عدتها رضيت بذٰلک أو لم ترض، كذا في الهداية. (الفتاوىٰ الهندية ٤٧٠/١ زكريا)

رجعت کی نفی کرنے کے بعد بھی رجعت کا اختیار رہتا ہے

اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دے کر کہا کہ: ''میں تجھ سے رجعت نہیں کروں گا'' یا ''میں نے رجعت کا حق باطل کردیا'' پھر بھی عدت کے اندر اس سے رجعت کا حق ختم نہ ہوگا بلکہ اگر وہ رجعت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

ولو قال: أبطلت رجعتي أو لا رجعة لي عليک كان له رجعة، كذا في النهر الفائق. (الفتاوىٰ الهندية ٤٧٠/١ زكريا) **لأنه حكم أثبته الشارع غير مقيد برضاها، ولا يسقط بالإسقاط كالميراث.** (شامي ٢٧/٥ زكريا)

رجعت کے الفاظ

اگر کوئی شخص بیوی کو طلاق رجعی دینے کے بعد دورانِ عدت درج ذیل یا ان کے ہم معنی الفاظ میں سے کوئی لفظ کہہ دے تو بیوی دوبارہ اس کے نکاح میں آجائے گی، مثلاً کہے:

(۱) میں نے تجھ سے رجعت کی۔

(۲) میں نے تجھے واپس لے لیا۔

(۳) میں نے تجھے اپنے نکاح میں روک لیا۔

(۴) میں نے اپنی بیوی سے رجعت کی، وغیرہ۔

ان الفاظِ صریحہ سے بلا نیت بھی رجعت ہوجاتی ہے۔

بنحو راجعتک ورددتک ومسکتک بلا نية؛ لأنه صريح (الدر المختار) ومثله: راجعت امرأتي في حال غيبتها وحضورها أيضًا، ومنه ارتجعتک ورجعتک.

(شامي ٢٤/٥ زكريا، الفتاوىٰ التاتارخانية ١٣٨/٥ رقم: ٧٤٧٨ زكريا)

زبردستی رجعت کے الفاظ کہلوانا

اگر کسی شخص نے بیوی کو طلاق رجعی دی، پھر اس کو زبردستی ڈرا دھمکا کر رجعت پر آمادہ کیا گیا اور اس نے خوف سے رجعت کے الفاظ زبان سے اَدا کردئے، تو رجعت درست ہوجائے گی۔

وتصح أي الرجعة مع إكراه. (الدر المختار مع الشامي ٢٤/٥ زكريا)

مذاق میں رجعت کے الفاظ کہنا

مذاق میں رجعت کے الفاظ کہنے سے یا کوئی فعل کرنے سے بھی رجعت درست ہوجاتی ہے۔

وتصح مع إكراه وهزل ولعب (الدر المختار) فسرهما في القاموس بضد الجد. (الدر المختار مع الشامي ٢٤/٥ زكريا)

سبقت لسانی میں رجعت کے الفاظ نکل گئے

اگر سبقت لسانی میں یعنی آدمی کہنا کچھ اور چاہتا تھا مگر رجعت کے الفاظ نکل گئے، تو ان الفاظ سے بھی رجعت درست ہوجائے گی۔

وتصح مع ..... خطأٍ (الدر المختار) كإن أراد أن يقول: اسقني الماء، فقال: رجعت زوجتي. (الدر المختار مع الشامي ٢٤/٥ زكريا)

لفظِ نکاح اور تزویج سے رجعت کرنا

اگر کوئی شخص لفظ نکاح اور تزویج سے رجعت کرنا چاہے، مثلاً یہ کہے کہ میں نے تجھ سے نکاح کیا، یا میں نے تجھ سے شادی کی، تو اس سے بھی رجعت صحیح ہوجائے گی۔

وإن راجعها بلفظ التزويج جاز عند محمد رحمه الله تعالىٰ وعليه الفتوىٰ، وكذا إذا تزوجها صار مراجعًا لها وهو المختار، كذا في الجوهرة النيرة. ولو قال لها:

نكحتك كان رجعة في ظاهر الرواية، كذا في البدائع. (الفتاوىٰ الهندية ٤٦٨/١-٤٦٩ زكريا) **والأول قسمان: صريح كما مثل، ومنه: النكاح والتزويج وبدأ به؛ لأنه لا خلاف فيه.** (شامي ٢٤/٥ زكريا)

عدت کے دوران رجعت کے لئے باقاعدہ نکاح کرنا

اگر کوئی شخص اپنی مطلقہ رجعیہ سے عدت کے دوران باقاعدہ نکاح کرے تو نکاح سے اس کی رجعت درست ہوجائے گی اور پہلے کی طرح بیوی اس کی منکوحہ بن جائے گی۔

وتصح يتزوجها في العدة به يفتى (الدر المختار) قال في البحر: وهو ظاهر الرواية، كذا في البدائع، وهو المختار، كذا في الولوالجية وعليه الفتوىٰ، كذا في الينابيع. (الدر المختار مع الشامي ٢٦/٥ زكريا)

رجعتِ کنائی کا حکم

اگر کوئی شخص رجعت میں صریح الفاظ کے بجائے کنائی الفاظ استعمال کرے، مثلاً یہ کہے کہ ''تو میرے پاس اسی طرح ہے جس طرح پہلے تھی''، یا ''تو میری بیوی ہے''، تو اگر رجعت کی نیت سے یہ الفاظ کہے گا تو اس سے رجعت درست ہوجائے گی۔

وكناية: مثل أنت عندي كما كنت وأنت امرأتي فلا يصير مراجعاً إلا بالنية، أفاده في البحر والنهر. (شامي ٢٤/٥ زكريا، الفتاوىٰ الهندية ٤٦٨/١ زكريا، الفتاوىٰ التاتارخانية ٥/ ١٤٣ رقم: ٧٤٩٤ زكريا)

فضولی کی رجعت کا حکم

اگر کوئی شخص دوسرے کی مطلقہ رجعیہ سے کہے کہ میں اس کی طرف سے تجھ سے رجعت کرتا ہوں اور وہ (شوہر) اسے قبول کرلے تو اس سے رجعت متحقق ہوجائے گی۔

وفي القنية: إن أجاز مراجعة الفضولي صح، كذا في البحر الرائق. (الفتاوىٰ الهندية ٤٧٠/١ زكريا)

رجعتِ فعلی

رجعت جس طرح زبان سے الفاظ سے درست ہوجاتی ہے، اسی طرح زبان سے کچھ کہے بغیر ایسا

فعل کرنے سے بھی صحیح ہوجاتی ہے جوصرف میاں بیوی کے درمیان جائز ہو، مثلاً: صحبت کرنا، شہوت کے ساتھ بوسہ لینا، عورت کی شرم گاہ کو دیکھنا، یا بدن کو ہاتھ لگانا وغیرہ؛ البتہ اس طریقہ پر رجعت کے بعد گواہوں کے سامنے دوبارہ رجعت کرنا مستحب ہے؛ تاکہ بعد میں کوئی شبہ نہ رہے۔

وبالفعل كمس أي بشهوة. (شامي ٢٥/٥ زكريا)

وإن راجعها بالفعل مثل أن يطأها أويقبلها بشهوة أو ينظر إلى فرجها بشهوة فإنه يصير مراجعًا عندنا إلا أنه يكره له ذٰلك، ويستحب أن يراجعها بعد ذٰلك بالإشهاد، كذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوىٰ الهندية ٤٦٨/١ زكريا، الفتاوىٰ التاتارخانية ١٣٩/٥ رقم: ٧٤٨١ زكريا)

سوتے ہوئے شوہر سے بیوی نے جماع کرلیا

شوہر سورہا تھا اِسی حالت میں اُس کی مطلقہ معتدہ رجعیہ نے اُس سے جماع کرلیا اور دخول کی نوبت آ گئی تو یہ عمل بالاتفاق رجعت سمجھا جائے گا (اور اِس میں مصلحت یہ ہے کہ استقرارِ حمل کی صورت میں بچہ کا نسب مشتبہ نہ ہو)

إذا أدخلت فرجه في فرجها وهو نائم ..... كان رجعة اتفاقاً، كذا في فتح القدير. (الفتاوىٰ الهندية ٤٦٩/١ زكريا)

پیچھے کے راستہ میں صحبت کرنے سے رجعت کا حکم

اگر کسی شخص نے طلاقِ رجعی دے کر بیوی کے پیچھے کے راستہ میں صحبت کی تو رجعت درست ہوجائے گی؛ کیوں کہ اِس میں بشہوت مس کرنا ضرور پایا جائے گا؛ البتہ ایسا کرنے والا شخص سخت گنہگار اور ملعون ہوگا۔

ووطئها في الدبر على المعتمد؛ لأنه لا يخلو عن مس بشهوة. (الدر المختار) قوله: على المعتمد: لأن عليه الفتوىٰ كما في الفتح والبحر، والمعتبر هنا المس بالشهوة. (الدر المختار مع الشامي ٢٦/٥ زكريا، الفتاوىٰ الهندية ٤٧٠/١ زكريا)

❍❖❍